ایک عورت کی نوٹ بک

سدھا اروڑا

مترجم
ڈاکٹر ظفر عالم

ایک عورت کی نوٹ بک

(مصنف: سدھا اروڑا)

مترجم

ڈاکٹر ظفر عالم

ناشر
کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی

Ek Aurat Ki Note Book
by
Sudha Arora

Translated by

Dr.Zafar Alam

Mohalla Abu haleem patti, Post Mau Aima, Distt:Allahabad
(Paryagraj) U.P. Pin:212507
Mobie: +91 9935212009   Email:zafar.net2011@gmail.com

Year of Edition: 2021

ISBN: 978-93-90860-36-4

نام کتاب	:	ایک عورت کی نوٹ بک (سدھا اروڑا)
مترجم وناشر	:	ڈاکٹر ظفر عالم
سن اشاعت	:	۲۰۲۱ء
قیمت	:	-/۹۶ روپے
تعداد	:	۵۰۰
ناشر و مطبع	:	کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی موبائل:8851148278
رابطہ/پتا	:	محلّہ ابو حلیم پٹی، پوسٹ مؤ آئمہ، ضلع الہ آباد (پریاگ راج) یو۔پی، پن کوڈ:۲۱۲۵۰۷

’’یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ شائع شدہ مواد سے اُردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔‘‘

انتساب

مربی و مشفق والدین

اور

عزیز بہنوں

بے نظیر انصار اور غزالہ انصار

کے نام

•

فہرست

حرفِ چند

ادب میں تانیثیت (Feminism) کی بحث مغرب کی مرہون منّت ہے۔نئی عورت کے وجوداوراس کے تشخص پر جتنی تحریکات وتصنیفات وجود میں آئیں وہ سب مغربی مفکرین کے اورسوشل ریفارمرس کی جدوجہداورکاوشوں کا نتیجہ ہیں۔جوں جوں تانیثی ادب تخلیق کیا گیا ویسے ویسے تانیثی تنقید(Feminism Critics) بھی وجود میں آئی۔ ورجینا وولف اور سیمون دبوار نے اپنی تحریروں میں عورتوں کی ثقافتی شناخت اور معاشرے میں عورت کے مخصوص اور محدود کردار، مسائل اوران کے حل پر باقاعدہ بحث کی۔دیگر مصنفین نے نسوانی جنسیت اور خانگی تشدد کو موضوعِ بحث بنایا۔مغربی مفکرین کی نظر میں عورت اپنے جسم، ساخت اور جسم کی بدلتی حالتوں کے سبب مرد سے مختلف ہے۔جس کی رو سے عورت جنسی، جسمانی اور نفسیاتی طور پر مرد سے مکمل طور پر علاحدہ شناخت رکھتی ہے۔اس لیے تانیثیت کے علم برداروں، مصنفین اور مفکرین نے مذکرہ بالا باتوں کو خواب بینی، رومانیت، مثالیت، باغیانہ اور مفاہمانہ رویے سے تعبیر کیا۔بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے بعد ہندوستان میں تانیثی ادب پر خاص زور دیا جانے لگا تھا۔لیکن تقسیمِ وطن کے بعداس میدان میں خوب کارہائے نمایاں انجام دیے گئے۔

ہندی اوراُردوادب میں عورتوں کے مسائل پر جو بحث ومباحثہ ہوااس کے برآمد شدہ نتائج ہمیں یہی بتارہے ہیں کہ عورتوں پرظلم وتشدّد کرنا مردوں کا پیدائشی حق ہے۔ایسانہیں ہے کہ تمام مرد،عورتوں پرظلم وتشدد کرتے ہیں۔کہیں کہیں خلافِ توقع دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کا استحصال کرتی ہیں۔حالاں کہ ایسے معاملے معاشرے میں خال خال رونما ہوتے ہیں۔البتہ روزانہ اخبارات ورسائل اور ٹی.وی خبروں میں عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کی

کہانیاں پڑھنے، سننے اور دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھیں واقعات کو جب کوئی ادیب باضابطہ طور پر تحریر یا کتابی صورت میں پیش کرتا ہے تو اس کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں ایسے کئی قانون بنائے گئے جن میں عورتوں کے اوپر کیے تشدد کو جرم قرار دیا۔ ہندوستان میں خواتین کمیشن کو اسی غرض سے بنایا گیا کہ عورتوں کے اوپر ہونے والے ہر طرح کے تشدد کی روک تھام کی جائے اور مجرمین کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خانگی اور معاشرتی تشدد کی روک تھام کے لیے مرکزی حکومت نے 2006 میں قانون پاس کیا تاکہ معاشعرے میں خانگی تشدد کی شرح میں کمی آئے لیکن نتیجہ صفر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ عالمی سطح پر بھی عورتوں کی آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اس کے لیے عالمی پیانے پر سمینار اور سمپوزیم کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ نسائیت کی آزادی کے نام پر ''میرا جسم میری مرضی'' کے فلک شگاف نعرے اور ہاتھوں میں تختیاں لے کر سڑکوں پر جو ہنگامہ کیا جاتا ہے یہ کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایسی تنظیمیں سرگرم ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف نسائی آزادی کو فروغ دلانا ہے۔ ادیبوں کی بھی کئی تنظیمیں اس میدان میں سرگرم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود معاشعرے میں مردوں کی بالا دستی قائم و دائم ہے۔ اسی کے سبب مرد کو عورت کا نگہ بان تسلیم کیا گیا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ کیا مرد کی نگہ بان عورت کیوں نہیں ہوسکتی؟ اس سوال پر کئی لوگ خفگی کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے پطرس بخاری کی کی وہ تحریر یاد آرہی ہے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ عورت مرد نہیں بن سکتی، مرد عورت نہیں بن سکتا۔'' لیکن جدید میڈیکل سائنس نے اس کارنامے کو بھی کر دکھایا۔ اب عورتیں اپنے جسم کی ساخت بدلوا کر مرد بن رہی ہیں اور مرد اپنے جسم کے خاص حصے کو تبدیل کرانے کے بعد عورتوں کی زندگی جی رہے ہیں۔ ہمارا مقصد اس بحث کا رُخ تبدیل کرنا نہیں ہے۔ بنیادی بات یہی ہے کہ عورت کو ہی کیوں بار بار اگنی پریکشا سے گزرنا پڑتا ہے مرد کو کیوں نہیں؟ ان چبھتے ہوئے اور تیکھے سوالوں کو سُدھا اروڑا نے زیرِ نظر کتاب میں بار بار قارئین سے معلوم کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور عملی قواعد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشعرے میں جتنا حق ایک مرد کا ہے اس سے کہیں زیادہ حق عورت کا ہے۔ محترمہ نے اس کتاب میں کوئی بناوٹی یا خیالی دنیا کی باتیں تحریر نہیں کیں بلکہ انھوں

ذاتی مشاہدات کے سہارے اُن سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش جن کا تعلق نسائی ادب یا تانیثی اصول ونظریات سے ہے۔ موصوفہ نے ایسے سمیناروں اور ورکشاپوں کا تذکرہ کیا جن میں وہ محض اس لیے گئی تھیں کہ وہاں پر عورتوں کے حقوق کی باتیں عورتوں کی زبانی ہو رہی تھیں۔ لیکن جب مصنفہ نے عورتوں پر ہونے والے جسمانی، معاشی اور نفسیاتی تشدد کے بارے میں منتظمین اور مقررین سے سوالات معلوم کیے تو انھیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا۔

مصنفہ پولس اسٹیشنوں، فیملی کورٹ کے علاوہ پارکوں، کارخانوں، اسکولوں، مزدروں کی رہایش گاہوں پر بھی گئیں تا کہ عورتوں پر ہونے والے تشدد کی باریکیوں سے روبرو ہو سکیں۔ وہ اُن عورتوں سے بھی ملیں جن کی شادی ہوئے ایک زمانہ ہو گیا لیکن انھیں آج بھی ذہنی تشدد کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ انھوں نے ایسے گھروں کی عورتوں سے بھی ملاقاتیں کیں جو صاحبِ اولاد تھیں، جن کے پاس بنگلہ، بینک بیلنس، کاریں، مہنگے موبائل، مہنگے کپڑے، نوکر چاکر الغرض زندگی کی عیش و عشرت کا ہر سامان موجود تھا۔ اس کے باوجود ان کے شوہروں کا برتاؤ ان کے تئیں نا قابل احترام تھا۔ کیوں کہ ان کے شوہر جسمانی، قلبی، نفسیاتی اور ذہنی آسودگی کے لیے رات رات بھر گھر سے دور رہتے تھے۔ سُدھا اروڑا نے مہذب معاشرے کی ان غیر مہذب حرکتوں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہوئے عورتوں کی داخلی کیفیت کو طشت از بام کیا ہے۔ مصنفہ نے ایسی عورتوں سے بھی ہمیں متعارف کرایا ہے جنھوں نے اپنے بیمار شوہروں اور گھریلو ذمہ داریوں کا بار اپنے شانوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ ان کی نظر میں ایسی ہی عورتیں معاشرے میں تبدیلی لانے کی محرک ہوتی ہیں بھلے ہی ان کی تعداد قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ اس بارے میں سُدھا اروڑا رقم طراز ہیں:

> ''اگر خواتین کی قلیل تعداد سماج میں اعلا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اب عورتیں دوسرے درجے سے باہر نکل گئی ہیں اور اپنے حق کی آواز بلند کرنے لگی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے خواتین کی یہ تعداد ایک یا دو فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی ہے اور آج بھی معاشرے میں عورتوں کا ایک بڑا طبقہ مشکلات سے دوچار ہے۔ جو بھی دو فیصد خواتین نسوانی معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتی ہیں، چاہے ان کی

وابستگی سیاست سے ہو، پولس سے یا عدالتی امور سے ہی کیوں نہ ہو انھیں ہمیشہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے فیصلے کو ہمیشہ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔''

سُدھا اروڑا نے اپنی کتاب میں انگریزی اخبارات و رسائل کے اُن رپورٹوں کا بھی حوالہ پیش کیا جن میں عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی روداد اور اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے میٹروپولیٹن شہروں میں مقیم اعلا عہدوں پر فائز عورتوں کی کہانی بھی انھوں نے اس کتاب میں شامل کی۔ بالخصوص ان کی محبوب ترین مصنفہ منو بھنڈاری (و:15 نومبر 2021) سے جب انھوں نے یہ سوال معلوم کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ کے نسوانی کردار اذیت سے گزرنے کے باوجود مفاہمت اختیار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کو محسوس کرنے کے بعد بھی بغاوت نہیں کرتے۔ انھوں نے برجستہ کہا تھا ''یہ بتاؤ سماج میں کتنی عورتیں ہیں جو اپنے حقوق کے لیے باغیانہ تیور کے ساتھ نکل آتی ہیں؟ جب اصل زندگی میں ایسا نہیں ہوتا تو ہم کہانی میں کیسے دکھا سکتے ہیں۔'' خود منّو بھنڈاری بچپن میں اپنے گھر پر خانگی تشدد کی شکار رہی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے والدین ان سے صرف اس وجہ سے محبت نہیں کرتے تھے کہ ان کا رنگ کالا تھا جب کہ ان کی بڑی بہن سے سب لوگ اس وجہ سے دلار کرتے تھے کہ اس کا رنگ گورا تھا۔ لیکن ان کی والدہ نے ان کی شخصیت اور کردار سازی یہاں تک کہ ان کے مصنفہ بننے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

سُدھا اروڑا نے عورتوں کو اپنے گھروں میں عزّت سے جینے کی تلقین کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ہر عورت کو یہ حق ہے کہ شادی کے بعد اس کے شوہر کا گھر ہی اس کا اصل گھر ہوتا ہے۔ لیکن موصوفہ نے اپنے تجربے اور پولس اسٹیشنوں میں درج ہونے والے مقدمات کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی معاشرے میں ابھی بھی ایسے افراد موجود ہیں جو عورتوں کو صرف اس وجہ سے اپنے گھروں سے نکال باہر کرتے ہیں کہ انھوں نے ان کی مرضی کا کھانا نہیں بنایا، یا چائے میں چینی کم ڈالی یا عورت نے اپنے شوہر کی پسند کا کھانا شام کے وقت نہیں بنایا یا عورتوں کو اس وجہ سے بھی گھر سے نکال دیا گیا کہ انھیں صرف لڑکیاں پیدا ہوئیں لڑکا پیدا کیوں نہیں ہوا۔ کبھی کبھی تو معمولی نوک جھونک بھی طلاق کا سبب بن جاتی ہے۔ موصوفہ چاہتی ہیں کہ ہمیں مذکورہ بالا رویوں کو بدلنا

ہوگا۔ان کی نظر میں مرد کے مقابلے عورت کی پسند کا خیال رکھا جانا بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ وہی معاشرے کے نظام میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتی ہے۔کیا کسی معاشرے کا وجود اور استحکام کا تصور کسی عورت کے بغیر ممکن ہے۔ ہرگز نہیں؟ سُدھا اروڑا لکھتی ہیں کبھی کبھی مردوں کو بھی عورتوں کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔موصوفہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر عورتوں کی بے عزتی کرنا خانگی تشدد کی انتہا ہے۔بار بار دل شکن باتوں سے عورت کے وقار اور تشخص کو مجروح تو کیا جاتا ہی ہے ساتھ ہی اسے جو ذہنی ونفسیاتی اذیت سے دو چار ہونا پڑتا ہے وہ صورت نا قابل برداشت ہوتی ہے۔ مصنفہ اس بارے میں زور دے کر کہتی ہیں کہ عورت اور مرد کی خانگی زندگی میں اگر ایک بار درار آ گئی تو اسے بھرنا مشکل ہے۔وہ تا عمر اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کہیں سبزی میں نمک زیادہ تو نہیں ڈالا گیا یا چائے میں چینی کم تو نہیں یا آج شام کے کھانے میں صاحب کی پسندیدہ سبزی کے ذائقے میں کوئی کمی بیشی تو نہیں آئی ہے۔

بہر نوع! ڈاکٹر ظفر عالم نے سُدھا اروڑا کی کتاب ''ایک عورت کی نوٹ بُک'' کا اُردو ترجمہ بڑی جاں سوزی کے ساتھ کیا ہے۔انھوں نے اس ترجمے میں نفسِ مضمون اور منشائے مصنف کا خاص خیال رکھا ہے۔ ہندی اصطلاحوں کا ترجمہ انھوں نے اُردو زبان و ادب کی اصطلاحوں کے ساتھ سلیقگی کے ساتھ کیا ہے۔موصوف نے ہندی زبان کے مشکل الفاظ کو سہل اور آسان زبان میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر ظفر عالم نے اپنی محنت شاقہ سے ''ایک عورت کی نوٹ بُک'' کو اُردو میں منتقل کیا ہے وہ قابل ستائش اور قابل رشک ہے۔اس کتاب کے منصۂ شہود پر لانے کے لیے میں موصوف کو بہ صمیم قلب مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ظفر عالم مستقبل میں اپنا ادبی سفر یوں ہی رواں دواں رکھیں گے۔

ڈاکٹر ابراہیم افسر

نگر پنچایت سِوال خاص، میرٹھ (یو.پی)

18/12/2021

• • •

عرضِ مترجم

خدا نے دنیا کی تخلیق کرنے کے بعد اس میں رہنے والی تمام مخلوقات کے جوڑے بنائے۔اسی زمرے میں مرد اور عورت بھی شامل ہیں۔دونوں ایک سکّے کے دو پہلو ہیں۔بغیر ایک کے دوسرا ادھورا ہے۔لیکن رفتہ رفتہ زمانہ گزرا اور اس کے ساتھ ہی انسانی معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انسانی خمیر میں ایک گہرا عنصر یہ پایا جانے لگا کہ بغیر بالا دستی کے وہ دوسرے لوگوں پر زور نہیں چلا سکتا۔اسی زیر و زبر میں مرد،عورت کا مسئلہ بھی وجود میں آیا۔خاص کر مرد نے اپنی بالا دستی عورتوں پر قائم کرنی چاہی جس کے تحت زمانہ قدیم سے یہ موضوع زیر بحث رہا کہ عورت کا سماج میں کیا مقام و مرتبہ ہے اور یہ مسئلہ ہنوز جاری ہے۔

زیر ترجمہ کتاب ''ایک عورت کی نوٹ بک'' مذکورہ باتوں کا احاطہ کرتی ہے۔کتاب کی مصنفہ سودھا اروڑا جنھوں نے اپنی حیات کا پورا حصہ مرد،عورت کے مسئلے کو سلجھانے میں صرف کر دیا۔ انہیں تجربات پر مبنی یہ کتاب ہمارے روبہ رو ہے۔یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ ''خانگی تشدد کے خلاف'' جس میں چار کہانیاں اور مضامین شامل ہیں۔دوسرا باب ''ذہنی تشدد کے خلاف'' میں سات کہانیاں اور مضامین شامل ہیں۔سدھا اروڑا اپنی کہانیوں اور مضامین کے ذریعے عورتوں کے سلب کیے گئے حقوق کو دلانے کی متمنی ہیں۔انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں ہر اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جو ایک عورت کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

کتاب میں شامل کہانی اور مضامین ہمیں اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں ایک عام انسان اور قاری کی رسائی ممکن نہیں۔سدھا اروڑا نے ہر اس پہلو کو بہت بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے جو ایک عورت اور اس کی خوشی کے لیے کار آمد ہو سکتے ہیں۔مردوں کی بالا دستی اور مظالم جو

عورتیں برداشت کرتیں ہیں ان سبھی کے لیے بالکل واضح پیغام اس کتاب کی کہانیوں میں موجود ہے۔کہانیوں کا اندازِ بیان بالکل منفرد ہے جو قاری کے دل پر اثر کرتا ہے۔سدھا اروڑا کی خاص بات یہ ہے کہ کہانی لکھنے کے بعد اس کہانی کا تجزیہ بھی بیان کرتی ہیں تاکہ قارئین کی رسائی ان کے حسب منشا تک بآسانی ہو سکے۔

میرے ذہن میں اس کتاب کے ترجمے کا خیال ان کی کہانیوں اور مضامین پڑھنے کے بعد ہوا۔واقعی سدھا اروڑا نے اپنے خون جگر سے کتاب کو مزین کیا ہے،خاص بات یہ ہے کہ یہ کتاب عورت کے سماجی،معاشی اور نفسیاتی پہلو کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد کرتی ہے،ساتھ ہی اس کا حل بھی بیان کرتی ہے۔

ترجمے کے دوران اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بات قاری تک منشۂ مصنفہ کے مطابق پہنچے۔امید ہے کہ اہل علم حضرات کتاب کو پڑھ کر سماج کو خوش رنگ کرنے کی سعی کریں گے نیز سماج میں عورت کی قدرومنزلت بڑھے گی۔

بڑے بھائی جاوید عالم ضیاء،استاد محترم ڈاکٹر محمد نوشاد عالم،ڈاکٹر شاداب عالم،ڈاکٹر اجے مالوی،مولانا محمد شہاب الدین قاسمی رحمانی،ڈاکٹر ابراہیم افسر،ڈاکٹر گیانیندر سنگھ،ڈاکٹر شمیم اختر،ڈاکٹر عادل احسان،ڈاکٹر شفیع احمد،تنظیم عالم،ارشاد علی،محمد راشد اور محمد آفاق کے علاوہ تمام معاونین اور مخلص دوستوں کا شکرادا کرنا چاہوں گا۔جن کی وجہ سے یہ کام آسان ہوا اور مشکل وقت میں حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

ڈاکٹر ظفر عالم
〈خالدظفر〉

03.12.2021

● ● ●

پیش لفظ

زندگی کی شاہراہ سے گزرتے ہوئے

ادب سماج کا آئینہ ہے یہ مقولہ ہمیشہ دہرایا جاتا ہے۔لیکن اس کے بالمقابل ادبی سماجیات کا عمرانی پہلو آج بھی ادب میں مرکزی حیثیت نہیں حاصل کر پایا۔ادب اور سماج کے فرق نے ادب کو صرف فنی خوبیوں تک محدود کر دیا۔جس کے سبب یہ خیال معرض وجود میں آیا کہ سماجی پہلوؤں کا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ ادب کی سماجی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔اس کے باوجود ادبی رسالوں میں سماجیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

13 نومبر 2000 کو دہلی کے سائنس سینٹر میں عورتوں پر کیے جانے والے خانگی تشدد سے متعلق قانون سازی کے لیے، تیسری قومی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔جس میں پورے ملک کی سماجی کارکنان کے ساتھ ساتھ مہمان خصوصی کی حیثیت سے صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل بھی شریک تھیں۔ ملک کی کئی مشہور ومعروف سیاست دانوں کے علاوہ خواتین کمیشن کے اعلیٰ منصب پر فائز خواتین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔جب مائک کا رخ کانفرنس میں موجود سامعین کی طرف کیا گیا تو وہ خانگی تشدد سے متعلق قانون سازی کے بجائے اپنی ذاتی زندگی کے مسائل پر بات کرنے لگیں۔ظاہر ہے وہ کانفرنس نہ تو مشاورات کی آماجگاہ تھی نہ ہی تھانہ اور نہ ہی عدالت کا کٹھگھرا۔اس لیے ان اراکین کو اپنی ذاتی زندگی سے متعلق بیانات دینے سے روکا گیا۔

تقریباً دو ہزار عورتوں سے سائنس سینٹر بھرا ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ خواتین کمیشن سے وابستہ عورتیں خود اپنی خانگی زندگی میں ذہنی اور جسمانی تشدد کا شکار ہوتی رہی ہیں۔حتیٰ کہ ڈپریشن

میں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے ذاتی تجربے کو اجاگر کرنے لگتی ہیں۔

اگر خواتین کی قلیل تعداد سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اب عورتیں دوسرے درجے سے باہر نکل گئی ہیں اور اپنے حق کی آواز بلند کرنے لگی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے خواتین کی یہ تعداد ایک یا دو فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی ہے اور آج بھی معاشرے میں عورتوں کا ایک بڑا طبقہ مشکلات سے دوچار ہے۔ جو بھی دو فیصد خواتین نسوانی معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتی ہیں، چاہے ان کی وابستگی سیاست سے ہو، پولس سے یا عدالتی امور سے ہی کیوں نہ ہو انھیں ہمیشہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے فیصلے کو ہمیشہ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

خانگی تشدد کے تحفظ کو قانونی شکل دینے میں سپریم کورٹ سے وابستہ محترمہ اندرا جے سنگھ اور ان کے ساتھ سماجی کارکنان کی پوری ٹیم کو دس سال کی مشقت برداشت کرنی پڑی۔ 1995 میں خانگی تشدد کے تحفظ سے متعلق پہلا ڈرافٹ، 1998 میں دوسرا، لیکن اکتوبر 2006 میں اسے نافذ کیا جا سکا۔ استحصال شدہ عورتوں کے ایک بڑے طبقے کو اس قانون کے تحت کیا کیا حقوق حاصل ہیں معلوم ہی نہیں اور اسی لاعلمی کے سبب تحفظات کا نفاذ نہیں ہو پاتا۔

13 نومبر 2009 کی تیسری قومی کانفرنس میں خانگی تشدد سے متعلق تنقیدی و تحقیقی رپورٹ انگریزی زبان میں قیمتی و نفیس اوراق سے مزین تھی۔ 214 صفحات پر مشتمل یہ دیدہ زیب کتاب کانفرنس میں شریک ان خواتین کو تقسیم کی گئی جس کی 80 فیصد زبان ہندی یا دوسری صوبائی زبانوں پر منحصر تھی۔

یہ باور کرایا جاتا ہے کہ خواتین کے لیے پہلے سے زیادہ سازگار ماحول ہے۔ موجودہ دور میں وہ اپنے حقوق کا مطالبہ پرزور طریقے سے کرنے لگی ہیں۔ خواتین میں خود اعتمادی روز بہ روز فروغ پا رہی ہے۔ لیکن اس خوش آئند اقدام سے خواتین پر تشدد کی شکلیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ خواندہ اور ملازمت سے منسلکہ عورتوں پر تیزابی حملوں کے علاوہ دفاتر میں جسمانی استحصال کے واقعات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ جہاں ایک طرف مثبت اقدام سے ماحول سازگار ہوا وہیں منفی پہلوؤں سے انارکی بھی پھیل رہی ہے۔

عالمی ادارہ برائے صحت (WHO) کی جون 2013 کی رپورٹ میرے سامنے ہے اس کے مطابق بین الاقوامی سطح پر تین میں سے ایک عورت خانگی تشدد کا شکار ہے۔ خاص کر ہندوستان اور وسط ایشیا کی عورتیں زیادہ متاثر ہیں۔ مذکورہ ادارے کے ''ویمین چائلڈ ہیلتھ'' کی صدر شعبۂ ''فلیویا بترائیو'' کے مطابق یہ اعداد شمار کافی حیران کن ہیں کیوں کہ یہ کسی ایک ملک کا معاملہ نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح کی یہی صورت حال ہے۔

اکثر خواتین کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ عورتوں کے حقوق سے متعلق انگریزی زبان میں لاتعداد کتابیں موجود ہیں۔ لیکن ہندی زبان پر دست رس رکھنے والی عورتیں، خواتین حقوق سے متعلق کہاں سے شناسائی حاصل کریں۔ ان کے لیے کتابیں کہاں ہیں۔ کالج کی طالبہ کے مطالعے کے لیے انگریزی زبان میں ''ویمن اسٹڈیز'' اور ہندی میں ''استری ویمرش'' کے موضوعات پر لاتعداد کتابیں کتب فروشوں کے پاس موجود ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مذکورہ طلبہ کے علاوہ خواندہ اور ناخواندہ عورتوں کے ساتھ ساتھ سماجی کارکنان خواتین کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جنھوں نے نسوانی تشدد کو کسی نہ کسی طرح سے قریب سے دیکھا یا برداشت کیا ہے۔ اور انھیں اس حالت زار سے نکالنا آسان نہیں۔

ہندی ادب میں موجود Feminism سے متعلق باتیں ان عورتوں تک محدود ہیں جو کسی نہ کسی طرح سے اپنے حقوق کے بارے میں بخوبی جانتی ہیں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ جو عورتیں اپنے حقوق سے ناواقف ہیں ان کی زبان میں بھی خواتین کے حقوق سے متعلق مواد پیش کیا جائے تاکہ وہ اپنی مشکلات سے بآسانی نکل سکیں۔

ادب کی مختلف اصناف میں سے ایک صنف کہانی ہے۔ مختصر ہونے کے سبب دوسری اصناف سے زیادہ مقبول ہے۔ ایک مصنف کہانی کیوں لکھنا پسند کرتا ہے۔ اس کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔ میرے لیے کہانی لکھنے کا مقصد زندگی میں رونما ہونے والے حیرت انگیز واقعات کو بیان کرنا نہیں ہے۔ یوں تو روز بہ روز ہمارے آس پاس کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اس سے ہم کہانی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن کسی کردار یا واقعات کو ہم اس وقت تک کہانی کی شکل نہیں دے سکتے جب تک کہ سماج میں اس سے اہم اثرات ثبت نہ ہوسکیں۔ کہانی تحریر کرتے وقت حقیقی کردار ذہن سے

دور ہو جاتے ہیں لیکن اس کا اہم مقصد ہمارے نزدیک ضرور ہوتا ہے۔ایسے کردار مصنف کے ذہن میں خلل پیدا کر کے ایک نئی کہانی لکھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔کہانی لکھنے والا کبھی کبھی مختلف کرداروں کو ایک کہانی میں سمیٹ دیتا ہے لیکن کچھ کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو مختلف کہانیوں میں الگ الگ شکل میں موجود ہوتے ہیں۔

کیا کہانی عورتوں کو دوپہر میں سکون کی نیند لانے کے لیے تحریر کی جانی چاہیے؟ کیا زیادہ تر کہانیوں کا موضوع حظ و انبساط کے لیے ہونا چاہیے؟ ایسا بالکل نہیں ۔یہ حقیقت ہے کہ مختصر کہانیوں سے سماج میں بڑی تحریک نہیں لائی جاسکتی۔لیکن معاشرے کے اردگرد بکھری خامیوں اور خوبیوں کو بہتر طریقے سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ساری اصناف میں کہانی بھی مذکورہ بالا کردار ادا کرتی ہے۔عام طور پر گھریلو عورتیں اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں بچوں کی پرورش، گھر کے خرچ اور مطبخ کے روٹین سے الگ ہو کر دوپہر کے خالی اوقات میں سلائی وغیرہ میں وقت صرف کرتی ہیں۔اسی طرح تعلیم یافتہ عورتیں دوپہر کے وقت مختلف رسالے پڑھتی ہیں۔ان کے لیے کہانی کا مطالعہ صرف اسی حد تک ہوتا ہے کہ انھیں کہانی پڑھتے پڑھتے بہتر نیند آجائے ،اور روزمرہ کے روٹین سے کچھ نجات حاصل کرسکیں۔میں دوپہر کی فرصت میں نیند لانے کے لیے کہانیاں تحریر نہیں کرتی ۔کہانی پڑھ کر نیند بھاگ جائے اور پڑھنے والے کے دماغ میں کچھ خلل پیدا کرے، کچھ سوچنے پر مجبور کرے، گھر کے پس پشت ڈالے گئے اور نظر انداز کیے گئے غیر دلچسپ واقعات کی منظر کشی بیاں کردے۔تب ہی کہانی لکھنے کا مقصد پوارہوتا ہے۔

تیس سال پہلے 1984 میں کلکتہ دوردرشن کے لیے میں نے ہندی ادب کی مشہور مصنفہ منو بھنڈاری کا انٹرویو لیتے وقت، ان سے ایک سوال پوچھا تھا۔کیا بات ہے کہ آپ کے نسوانی کرادر اذیت سے گزرنے کے باوجود مفاہمت اختیار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔زندگی کی تلخیوں کو محسوس کرنے کے بعد بھی بغاوت نہیں کرتیں۔انھوں نے برجستہ کہا تھا۔’’یہ بتاؤ سماج میں کتنی عورتیں ہیں جو اپنے حقوق کے لیے باغیانہ تیور کے ساتھ نکل آتی ہیں؟ جب اصل زندگی میں ایسا نہیں ہوتا تو ہم کہانی میں کیسے دکھاسکتے ہیں۔‘‘

آج منو جی کے اس جواب کو یاد کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر کا وہ مقولہ یاد آتا ہے کہ

مظلوم کو مظالم کی پہچان کرنا ضروری ہے۔ بغاوت تو وہ اپنے آپ کرنے لگے گا۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی خواتین کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اسے اپنے وجود کو روندنے والے مختلف حالات اور واقعات کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر استحصال کی خاص کر ذہنی تکالیف کا علم ہی نہ ہو تو ساری توانائی دوسری جگہ صرف ہو جاتی ہے۔ بغاوت کرنا تو دور کی بات ہے نہ سازگار حالات کی شناخت کر کے کیسے نمٹنا ہے اس کا بھی علم اس کے پاس نہیں ہے۔

واضح رہے کہ تیس سال قبل مصنفہ منوّ بھنڈاری نے کہا تھا کہ ''ہمارے بھارتیہ سماج میں کتنی عورتیں ہیں جو بغاوت کا علم لیے میدان کارزار میں اتر آتی ہیں۔'' اپنے اس قول کے دس سال بعد منوّ جی نے نہ صرف اپنی زندگی میں ایک اہم فیصلہ لیا اور سماجی دباؤ کے باوجود تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے بلکہ اس مشکل فیصلے پر وہ جمی رہیں۔ حالاں کہ اس فیصلے کے بدولت وہ اذیت بھری زندگی سے باہر نکل آئیں اور ایک عزت بخش زندگی گزارنا ان کے لیے آسان ہو گیا۔

منوّجی کی طرح نہ جانے کتنی عورتیں اذیت بھری زندگی سے ایک مدت تک ہی سمجھوتا کر سکتی ہیں۔ عورتوں میں اتنا شعور تو ضرور ابھر کر سامنے آیا ہے کہ وہ غلط اور تشدد کے خلاف گھر کی چہار دیواری کے اندر آواز بلند کرنا سیکھ گئی ہیں۔ مزید سیکھ بھی رہی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈری سہمی روتی بلکتی پیروں پر گری پڑی گڑگڑاتی اور منتیں کرتیں عورتیں کبھی بھی ظالم مردوں کو بدل نہیں سکتیں۔ بلکہ وہ اسے اور لطف اندوزی سے ہم کنار کرتیں ہیں۔ انانیت سے بھرے مرد کو زیر کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ عورت آہ و زاری کرنے کے سارے حربے کو ختم کر دے۔ جو کبھی پاؤں پر گری رہتی تھی، جس دن اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کا ہنر سمجھ جاتی ہے اور جس دن معاشی اور جذباتی انحصار کو روند کر، اپنا ایک الگ مقام بنا لیتی ہے اور شوہر کو اپنی غم زدگی سے لطف دینا بند کر دیتی ہے۔ مرد کا پورا مقصد ہی رائیگاں ہو جاتا ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو کم تعلیم یافتہ عورتوں کے پاس بیٹھ کر پڑھنے کے بعد مذاکرے کے دوران یک جا کرنے کا خیال آیا کہ کہانیاں بے شک مختصر ہیں لیکن یہ خواتین کے کسی نہ کسی مسائل کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان مسائل پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حل تلاش کرنے کے لیے ترغیب بھی دیتی ہیں۔ خیال میں کہانی اور اور کہانی میں خیال دونوں منجمد ہیں۔ کسی خاص خیال

کو ثابت کرنے کے لیے بے شک کہانی نہیں تحریر کی جاتی لیکن صرف کاغذ کالے کرنے کے لیے یا دماغ کی عیاشی کے لیے کہانی باہر نہیں آتی۔

یہ حقیقت ہے کہ کہانی لکھنا ایک فن ہے اور کہانی کی فنی خوبیوں کو نظرانداز کر کے آپ خواتین کے حقوق اور مساوات کا پیغام نہیں دے سکتے۔ کہانی میں جیسا ہے اور جیسا ہوتا رہا ہے، ایسے ہی واقعات کو اکثر و بیشتر پیش کرتے ہیں۔ جب کہ مضامین اور تبصروں میں یا مختصر فلیپ میں عورتوں کی حالت جس طرح ہونی چاہیے، اس کے ذریعے بآسانی ہم ان کی ہمت افزائی اور نئی راہ دکھا سکتے ہیں۔ جو کام ادبی صنف کہانی کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا وہ مضامین، تبصرے یا مختصر جملوں کے علاوہ نظمیات کے ذریعے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ اصناف کے مرکبات کا نتیجہ اس کتاب کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں شامل ایک مضمون ''جس کے نشان نہیں دکھتے'' مشہور اخبار "The Hindu" کے 30.04.2008 کے شمارے کے پہلے صفحے پر شائع ہوا تھا۔ اس میں دی گئی میری میل آئی ڈی کی وجہ سے پورے بھارت سے تقریباً سو کے قریب پیغامات موصول ہوئے تھے۔ یہ مراسلات کچھ پریشان کی گئیں عورتوں کے کچھ ان کے بھائیوں کے اور کچھ ان کے بچوں کی طرف سے ارسال کیے گئے تھے۔ اس کے بعد مجھے یہ علم ہوا کہ ہمارے سماج میں خواتین پر تشدد کتنی خاموشی سے ہو رہا ہے اور ظاہر بھی نہیں ہو رہا ہے۔ غنیمت ہے کہ ملک کے سارے اہم شہروں میں خواتین حقوق کمیشن متحرک ہیں۔ اسی لیے انھیں عورتوں کے ہونے والے استحصال کے خلاف ایکشن لینے کو کہا گیا۔ آج اسے پڑھنے کے بعد بہت سی عورتیں لب کشائی پر آمادہ ہوئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میری ہمت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب مردوں کی طرف سے مثبت پیغامات موصول ہوئے۔ ان افراد کی آرا سے ضرور روشناس کرانا چاہوں گی جن کو اپنے نام اجاگر ہونے سے کوئی دقت نہیں۔

نینی تال میں خواتین کے حقوق سے متعلق کانفرنس میں ''چچی کی ہنسا'' پر میں نے ایک طویل مقالہ پڑھا تھا۔ جہاں ایک طرف مردوں کی جماعت بے چین نظر آئی وہیں عورتوں نے کہا کہ یہ تو ہمارے گھر روز ہوتا ہے۔ اس کی سمجھ ہمیں نہیں تھی لیکن آپ نے ہماری بات کہہ دی۔ گھر میں روپیہ لانے والا فرد تانا شاہ کی مانند ہوتا ہے۔ اپنی خامی اسے نظر ہی نہیں آتی۔ اس بات کی تمیز ہی نہیں ہوتی انھیں کہ گھر میں کس طرح رہا جاتا ہے۔ لیکن ایک مثبت پہلو یہ آیا کہ بیشتر مردوں

نے مذکورہ موضوع کو بہت ہی اہمیت کا حامل قرار دیا اور سماجی تبدیلی کی خواہش ظاہر کی۔

دوسرے دن ایک علاقائی بزرگ ادیب جناب سید ھیشور پرساد سنگھ بولے آپ کے مقالے کا ایک پیراگراف میرے احساس کو متاثر کر گیا۔ میں اب وہ نہیں ہوں جو کل تک تھا۔ یہ حقیقت ہے جب میں لکھ رہا ہوتا تھا اور کمرے میں میری اہلیہ چائے کا کپ اٹھانے یا بچے بال کھیلتے کھیلتے آجاتے تو میں بہت زور سے انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرتا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر پہ صرف میرا ہی حق ہے۔ ان کا نہیں، اب میں آپ کی بات یاد رکھوں گا۔ ایک نوجوان مصنف نے کہا، بہن آج کے بعد میں اپنی بیوی کے کھانے میں نقص نہیں نکالوں گا۔

ممبئی کے ایک چھوٹے رسالے میں میری ڈائری کے کچھ تحریر شائع ہوئی تھیں۔ ایک دن اس کے مدیر سنجیو دوبے نے فون پر بتایا ''میری اہلیہ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی۔ میں نے اسے روک کر کہا میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے آپ کی لکھی بات یاد آگئی کہ یہ شوہر حضرات نہیں جانتے کہ ان کی بیویوں کی آدھی بیماری تو ان کے شوہر کے ساتھ چلنے سے ہی ٹھیک ہو جاتی ہے۔''

مراٹھی زبان میں عورتوں کے مسائل پر ''اونبار ٹھ یا چیہ الیا ڈ پلیاڈ'' میں میرا مذکورہ مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ ایک دن لاتور سے پروفیسر ''راجا ہولکونڈے'' کا فون آیا۔ انہوں نے کہا میں آپ سے اپنا ایک تجربہ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے مضمون کا مطالعہ بہت ہی عرق ریزی سے کیا ہے اور مجھے یہ احساس ہوا کہ میں بھی تو یہی کر رہا ہوں۔ گھر پہنچتے ہی اتنا چیخنے لگتا ہوں کہ گھر کے سارے افراد دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ میری اہلیہ بھی میرے سامنے آواز نہیں کرتی۔ یہ احساس ہوا کہ مجھے اپنے اندر تبدیلی لانی چاہیے۔ کچھ دن میں نے اپنے فیصلے پر عمل کیا۔ چار دن بعد میری اہلیہ حیران و پریشان ہو کر مجھ سے بولی سب ٹھیک تو ہے؟ آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں نے اسے آپ کا مضمون مطالعہ کرنے کو کہا۔ اب ہماری زندگی پہلے سے بہت بہتر ہے۔ ماحول آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ عورتیں کس طرح سے خود کو ناساز ماحول میں ڈھال لیتی ہیں اور اسی میں زندگی گزارنے کی خوگر ہو جاتی ہیں۔

ایسے نہ جانے کتنی مثالیں میرے پاس ہیں۔ یہاں یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ

ادب سے تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔اس سے سماج نہیں بدلتا۔سماج میں قدم جما چکے فرسودہ خیالات اور غلط روایتوں پر ادب کا کسی بھی قسم کا اثر نہیں ہوتا۔ادب صرف پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔میرے ذاتی تجربے بتاتے ہیں کہ آپ سمجھ میں آنے والی زبان میں ایسے موضوعات پر بات کریں۔جو عصر حاضر میں عورت اور مرد میں تضاد پیدا کر رہے ہیں۔ایسا کوئی نہیں ہوگا جس کو اپنی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ کرنی ہو۔

پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تبدیلی وہیں آئے گی جو اپنے کو بہتر بنانے کے متلاشی ہوں گے۔یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔جو اپنی مردانہ انانیت کو ''فیدران دا کیپ'' کی طرح مزین کر کے بیٹھے ہیں۔وہ تاعمر اسی خمار کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں گے۔جو اپنے کو بدلنا چاہتے ہی نہیں۔انھیں کیا کوئی خاک بدلے گا ہر فرد ایک بڑے سماج کا حصہ ہوتا ہے۔قدیم زمانے سے پدرسری نظام کا بول بالا رہا ہے اور عصر حاضر کے لوگوں سے یہ گزارش ہے کہ مرد بدلیں ادباء سے بھی یہی امید ہے کہ وہ اپنی تحریر کا معیار بلند کریں اور اپنے پڑھنے والوں کو مہذب بنائیں۔اس کے لیے زندگی اور تحریر میں ایمانداری پہلی شرط ہے۔ان میں بھی ہم وہ تبدیلی چاہتے ہیں جو ایک عام مرد میں دیکھنے کے متقاضی ہیں۔

"My experience is that changing men is difficult but not impossible.

An alternative to violence mens learning to act non-violently.

It means co-operation instead of degrading,

It means equality instead of dominsnce,

It means dialogue instead of monologue,

It means communicating instead of control,

It means love instead of fear,hate and contempt,

Men must take responsibility for their violence and

dominance,"

Isdal,Leading psychologist,Alternative to Violence and dominance."

اپنے مقصد میں کتنی کامیاب ہو پائی ہوں یہ تو قارئین ہی طے کریں گے۔جن کے لیے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔اگر اس کتاب کے ذریعے خود سے آگاہی مختصراً ہی حاصل ہوتی ہے،تو میں اپنی کوشش کو مثبت تسلیم کروں گی۔

(سُدھا اروڑا)

•••

باب اول:

خانگی تشدد کے خلاف

سائنسدان کیڑے مکوڑے اور چرند و پرند پر کچھ تجربات کرتے ہیں۔ایک سائنسدان نے دو مینڈک لیے ،ایک مینڈک کو اس نے کافی گرم پانی میں چھوڑا۔گرم پانی کا درجہ حرارت برداشت سے باہر ہونے کے سبب وہ فوراً کود کر باہر آگیا۔اب اس نے دوسرے مینڈک کو سرد پانی میں ڈالا مینڈک اس میں آرام سے اچھلتا کودتا رہا،اس نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ سائنسدانوں نے آہستہ آہستہ پانی کا درجہ حرارت بڑھایا۔اور یک دم گرم کردیا۔مینڈک اس گرم درجۂ حرارت کا آہستہ آہستہ خوگر ہوگیا اور جب اس کا جسم گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکا تو فوت ہوگیا۔

خواتین کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔عرصہ دراز سے ان کو خوگر کیا گیا ہے۔وہ ہر طرح کی حرارت سے اس قدر خوگر ہو جاتی ہیں کہ ایک نئے گھر کے نئے ماحول میں نئے لوگوں کے درمیان آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔آخر کار یہ سمجھوتہ ان کے مانگ میں بھرے ہوئے سندور کی ارتھی تک دکھائی دیتا ہے۔

• • •

مضمون:

تشدد کے خلاف: ایک عام عورت کی آواز

کیا آپ کے شوہر آپ کو مارتے ہیں؟ کاؤنسلنگ کے لیے آئے ایک شخص نے مجھ سے برجستہ سوال کیا۔

'جی نہیں'۔ میں نے بہت تحمل سے جواب دیا۔ کاؤنسلنگ کا ہمارا پہلا ضابطہ اخلاق یہ ہے کہ بغیر غصہ ہوئے سامنے والے کی بات بغور سنی جائے۔

کیا انہوں نے آپ پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا؟ وہ پھر پر زور انداز میں گویا ہوا 'کبھی نہیں'، میں نے بہت ہی خود اعتمادی سے کہا، کسی مرد کا اپنی بیوی کو نہ مارنا ہی ایک اچھے اور باشعور شوہر کی صف میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔

تب تو بہت آئڈیل شوہر ہیں۔ انہوں نے کچھ متاثر ہونے کے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ پر ان کی مسکراہٹ میں طنز تھا اور یہ طنز ان کے اگلے جملے میں کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔ 'اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ سے سچی محبت نہیں کرتے'۔ شوہر کے لغت میں سچے پیار کی ساری خوبیوں کے مثالی بت کی شکل میں میرے سامنے موجود تھے۔

اس کے بعد یہ سمجھنے میں کہیں کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ اپنی اہلیہ کو بری طرح ہر پہلو سے زدوکوب کرنے کے بعد بھی وہ اپنی بیوی کو بہت زیادہ چاہنے والے شوہر کا مثالی نمونہ قرار دے رہے تھے، اور اپنے رویے سے مطمئن بھی تھے ۔

کیا ایک ماں جو اپنے بچے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے، اس پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتی؟ یا اس کے کسی غلط اقدام پر طمانچہ نہیں رسید کر دیتی۔ اگر آپ ایک ماں کے اخلاق پر سوالیہ نشان نہیں لگاتیں تو شوہر کے ہاتھ اٹھانے پر آپ کو کیوں پریشانی ہے؟ یہ اس شخص کی اگلی دلیل تھی۔

ایسی بیمار ذہنیت کے یہ واحد مرد ہیں، ایسی بات نہیں ۔ظاہر ہے وہ مذکورہ مردوں کی پوری ایک جماعت کی نمائندگی کر رہے ہیں جو آج بھی اس خیال کی ہم نوائی کرتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کے بجائے اس کے قدموں میں ہونا چاہیے۔

انھیں یہ بھی سمجھانا مشکل تھا کہ گرچہ ایک ماں بھی اپنے بچے پر طمانچہ رسید کرتی ہے تو یہ غیر اخلاقی عمل سمجھا جائے گا۔ایک طرح سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طاقتور انسان کے ذریعے معصوم اور بے گناہ پر جبراً ظلم ہے ۔لیکن جب وہی بچہ جوان ہو کر مزاحمت کے قابل ہو جائے گا تو وہ بجائے اس کے کہ وہ اپنا گال سہلانے کے ماں کے اٹھے ہاتھ کو نہ صرف پیچھے دھکیل دے گا بلکہ ماضی میں ماں کے ذریعے ان تمام طمانچوں کو سود کے ساتھ لوٹا دے گا۔اس وقت اسے یہ ذرا بھی احساس نہیں ہوگا کہ میری ماں نے کسی اور کے دیے ہوئے جسمانی تشدد کا غصہ اس کے کمزور اور نازک گالوں پر بے وجہ یا نہ معلوم غلطی کے تحت اتارا تھا۔

ماں کا بیٹے اور شوہر کا بیوی پر ہاتھ اٹھانا ایسا ہی ہے کہ جسمانی طور پر مضبوط مرد کا کمزور پر کیا گیا ظلم، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کی سارے مرد اپنی عورتوں پر ظلم کرتے ہیں۔لیکن ہمارا یہاں مقصد پدرسری نظام کی اہم وجوہات کو تلاش کرنا ہے۔

ہندوستانی مردوں کے ذریعے خواتین پر تشدد کے عام طور سے دو افسانے مشہور ہیں۔ پہلا یہ کہ اکثر نچلے طبقے کا مزدوری کرنے والا مرد غریبی اور بڑے خاندان کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنی عورتوں پر تشدد کرتے ہیں۔

دوسرا فرسودہ خیال یہ ہے کہ ہندوستانی مرد اپنے ہوش و ہواس میں وحشی پن اور تشدد کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ وہ مے نوشی، ڈرگس یا افیم کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا آپا کھو دیتا ہے۔"یہ الگ بات ہے کہ وحشی شوہر بیوی کو مارنے کی عادت ہو جاتی ہے ۔جو شراب، تمباکو، سگریٹ کی خوگری کی طرح نہیں چھوڑی جا سکتی"۔اس طرح کی فرضی باتیں ہمارے پدرسری نظام میں مردوں کے ذریعے گڑھ لی جاتی ہیں یا شوہر پرست عورتوں کے ذریعے تسلیم کر لی جاتی ہیں۔جنھیں بچپن سے ہی ان فرسودہ رسم ورواج کو برداشت کرنے کی تلقین کی جانے لگتی ہے۔

ہندوستان کے صرف ایک شہر بمبئی کے حقوق نسواں اور خواتین تنظیمی اداروں کے

معلومات عامہ کے مطابق ریسرچ کیا جائے تو یہ حیرت انگیز پہلو ظاہر ہوتے ہیں کہ بہت سے بین الاقوامی سطح پر مشہور و معروف مہذب سمجھے جانے والے مرد حضرات کسی نہ کسی کمزور پل میں ''جسے وہ اپنی مجبوری کہیں گے'' اپنی بیویوں کو زدوکوب کرتے ہیں ۔ان میں ایک اچھے سیاست داں، میوزیشین، گلوکارہ، فلم پروڈیوسر، ایکٹر، روشن خیال ادبا وغیرہ کی ایک طویل فہرست تیار کی جائے تو ایک عام قاری کی نظر میں ان کی شخصیت مسمار ہو جائے گی ۔سماج اور عوام کی عدالت سے الگ یہ ایلیٹ کلاس کی شخصیات اپنے گھر کی چہار دیواری میں یہ صرف مرد ہوتے ہیں اور یہ ان عام مردوں سے قطعی الگ نہیں ہوتے کہ جو یہ سمجھتے ہیں کی بیوی بغیر گوشت پوشت بغیر دل و دماغ کے ایک ایسا بے جان سابت ہے، جس پر مرضی کے مطاق حکومت کرنے کی بالا دستی خدا نے صرف مرد کے سپرد کی ہے ۔اس پر حکمرانی کے طریق کار جدا جدا ہو سکتے ہیں ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مشہور و معروف مردوں کی بیویاں کسی نہ کسی موڑ پر جا کر اپنے شوہروں سے مایوس نظر آتی ہیں ۔اندرا گاندھی سے لے کر شہزادی ڈائنہ تک فلیویا ایگنیس سے لے کر شہناز شیخ تک مینا کماری سے لے کر ڈمپل کپاڑیا تک سبھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے خاوندوں کی زدوکوبی کی تاریخ اپنے اندر سمیٹی ہوئی ہے۔

عام طور سے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے کسی عزیز و اقارب کے ذریعے مذکورہ معاملات میں بات کرنا قطعی پسند نہیں کرتے ۔ان کے مطابق یہ ان کا نجی معاملہ ہے اس موضوع پر کسی دوسرے شخص کی دخل اندازی انھیں ذرا بھی برداشت نہیں ۔ظاہر ہے کسی دوسرے کی دخل اندازی سے آں جناب کے بے نقاب ہونے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے ۔کئی مرتبہ تشدد کی وجہ معمولی سی بات پائی گئی ہے ۔مثلاً کھانے میں نمک کا کم ہونا بچے کی اسکول رپورٹ خراب ہونا، بیوی کا وقت پر حاضر نہ ہونا، بیوی کی ساڑی میں سکم کا ہونا یا بیوی کا سجنا سنورنا، بیوی کا غلط وقت پر غلط طریقے سے پیش آنا، یعنی بنیادی بات یہ ہے کہ اگر شوہر کسی بھی وجہ سے بیوی پر دست درازی کرنا چاہتا ہے تو بیوی کے چھینک سے لے کر کسی بھی حرکت کرنے تک ہزار وجوہات شوہر کی ناراضگی کا سبب بن سکتی ہیں۔

متوسط گھرانوں میں تشدد کی ایک اہم وجہ جہیز ہوتا ہے ۔عام طور پر ایک متوسط گھرانے کا لڑکا شادی کے بازار میں اپنے آپ کو سب سے مہنگی بکاؤ چیز سمجھتا ہے اور اس کی پوری قیمت نہ

ملنے پر اپنی بیوی پر ظلم وتشدد کرنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

اس پر نہ کوئی سوال اٹھایا جا سکتا ہے نہ کوئی درمیانہ راستہ نکالا جا سکتا ہے۔عورت پر تشدد کو دیکھنے کے باوجود پڑوسیوں سے لے کر پولیس تھانے تک سب اسی لیے خاموش رہتے ہیں کہ یہ ان کا نجی معاملہ ہے۔

مذکورہ پس منظر میں گاندھی جی کا مقولہ یاد آنا عام بات ہے کہ ظلم کرنے والے سے زیادہ ظلم برداشت کرنے والا اگر زیادہ نہیں تو برابر کا شریک کار ضرور ہوتا ہے۔لیکن ازدواجی زندگی میں ظلم برداشت کرنے والے کو ہم اتنی آسانی سے مجرم نہیں بنا سکتے۔کیوں کہ اس کے پیچھے پوری معاشرتی تہذیب کارفرما ہوتی ہے اور نہ جانے کس وقت اس دقیانوسی غیر اخلاقی پاسداری سے عورت کو نجات ملے گی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نہ انصافی برداشت کرنے والا فریق یعنی کہ عورت اس اعتبار سے تو ملزم ہے کہ وہ ایسی نارسائی کو برداشت کرنے میں اپنے مقدر کو قصوروار ٹھہراتی ہے۔بے شک ایسی سوچ وفکر کو پروان چڑھانے میں معاشرتی اور مذہبی رسم ورواج اہم کردار ادا کرتے ہیں۔جس کے بعد وہ سوچتی ہے کہ شادی کے بعد اس کے شوہر کا گھر اپنا گھر ہے اور اس گھر کی ساری عزت وآبرو کی حفاظت اسی کے کاندھوں پر ہے۔اگر اس کا شوہر بے وجہ مارتا ہے تو عورت ہی اسے چھپاتی ہے۔ کیوں کہ عورتوں کو خدشہ رہتا ہے کہ کہیں باہر کے لوگ سن نہ لیں اور گھر کی عزت بے آبرو ہو جائے گی۔

آج بھی خواندگی تشدد کو برداشت کرنے والی عورتیں جو خواتین حقوق کمیشن میں اپنی شکایتیں لے کر آتی ہیں ان میں بیشتر غریب اور متوسط گھرانے کی درمیانے عمر والی خواتین ہوتی ہیں۔ان کی عمر چالیس، پچاس کے درمیان ہوتی ہے۔ایسی خواتین سے بیشتر باتیں درج ذیل دائرے کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔

''کب سے آپ کے شوہر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں''؟

''جب سے شادی ہوئی''

''آپ نے کبھی کسی سے شکایت کی''؟

''نہیں، کبھی نہیں''

''کیوں''؟ سوچتی تھی گھر کی بات باہر کیوں نکالوں اور یہ احساس ہوتا تھا کہ کبھی تو یہ راہ راست پر آجائیں گے''

''آپ کے شوہر اس سے راہ راست پر آ گئے''؟

''نہیں، ہر مرتبہ یہ کوشش کرتی تھی کہ جوان کے غصے کا سبب ہے وہ نہ کروں، لیکن پھر دوسری وجہ پیدا ہو جاتی تھی''

''آپ کے پڑوسیوں کو معلوم ہے''

''جی ہاں''

انہوں نے کبھی بیچ بچاؤ کیا''؟

شروع میں وہ پوچھتے تھے لیکن میں ہی چھپا لیتی تھی۔ کبھی کہتی نل سے چوٹ لگ گئی، کبھی کہتی باتھ روم میں پاؤں پھسل گیا''

''جھوٹ کیوں بولتی تھی آپ''؟

''سوچتی تھی میرے شوہر کی عزت جائے گی تو پیشانی میری ہی نیچے ہوگی۔ بات باہر نکلے گی تو بچوں کو بھی طعنے ملیں گے۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی، ہم سب خاموشی سے بیٹھ جاتے تھے۔''

''اتنے سال گزرنے پر بھی آپ نے کسی کی مدد لینے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی''؟

''اس لیے کہ اب میرے جسم میں طاقت نہیں رہی، ساری عمر برداشت کیا لیکن اب مزید برداشت نہیں کیا جاتا۔''

یہاں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ عورتیں تشدد برداشت کر کے کیوں شہید ہو جاتی ہیں؟ کیوں اس دن کا انتظار کرتی ہیں جب ان کی قوت برداشت جواب دے جائے۔ جب ان کی ہڈیوں میں تشدد برداشت کرنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے پھر انہیں جینے اور مرنے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

ہمارے ادارے میں ایک پینسٹھ سالہ عورت ناکام ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد الگ ہونے کا فیصلہ لے کر آئی۔ جب کہ وہ صحت مند بھی نہیں تھی۔

''اس عمر میں الگ ہو کر کیا حاصل ہوگا''؟

''مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اب میں ایک ڈیڑھ سال سے زیادہ زندہ نہ رہوں گی۔ساری زندگی تو میں نے رودھوکر کاٹ دی۔ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ سر پر ایک تلوار لٹک رہی ہے۔اب زندگی کے بچے ہوئے جو بھی دو چار چھ مہینے ہیں۔اپنی طرح سے آزاد ہو کر جی لوں۔بچپن سے مجھے کبھی بھی آزادی کی خوشی نہیں میسر ہوئی۔پہلے ماں باپ پھر شوہر اس کے بعد بچے رعب دکھاتے ہیں۔اب بچے بیرون ملک سیٹل ہوگئے تو شوہر نے پھر لگام تھام لی۔جس طرح کینسر کے آخری مرحلے والے ''ٹرمنل اِل'' مریض کو آرام و آسائش کے لیے چند گھنٹوں یا دنوں یا مہینوں کی خوشی کے لیے لایا جاتا ہے۔ٹھیک اسی طرح میں اپنے مرنے سے پہلے آزادی کی خوشی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

اس طرح زندگی کے آخری ایام کی بغاوت یا زندگی جینے کی خواہش دیکھ کر خود بہ خود یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے نوجوانی کے حسین لمحات کو امور خانہ داری میں صرف کرتے وقت عورتوں کو آزاد ہو کر رہنے کا احساس ذرا بھی پریشان نہیں کرتا؟ کیوں شادی کے بعد وہ جوانی کا پورا وقت ایک مثالی بیوی اور ایک اچھی ماں بننے کی تگ ودو میں اپنی زندگی گزار دیتی ہے؟ پھر بھی حاصل کچھ نہیں ہوتا۔اپنی زندگی کے خوبصورت بیس پچیس سال ناکام ازدواجی زندگی کے نام کر دینے کے بعد یہ دیکھتی ہے کہ اس میں بڑی بات کیا ہے؟ یہ تو اس کا فرض تھا۔یہ ناشکری کا رویہ نہ صرف شوہر بلکہ بچوں میں بھی صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے اور بچانے میں زیادہ تر عورتیں اپنی شناخت قائم کرنے کے سارے دروازے بند کر چکی ہوتیں ہیں۔جب تک جسمانی تشدد کو برداشت کرنے والی عورت ہوش میں آتی ہے وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی ہوتی ہے جہاں وہ نوکری کرنے اور خود کفیل ہونے کے قابل نہیں رہتی۔

عام طور پر گھر میں رہنے والی بیوی یا گھر کا خیال رکھنے والی گھریلو عورت ہی شوہر کا شکار ہوتی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نوکری پیشہ والی عورتوں کے شوہر ان کی انتھک محنت کے بدولت انھیں آنکھوں پر بٹھا کر رکھتے ہیں۔اس پر باہر دفتری بوجھ کتنا بھی ہو گھر پہنچ کر اسے وہی کام کرنا ہوگا جو ایک جاہل یا کم پڑھی لکھی عورت کرتی ہے۔مطبخ کی پوری ذمے داری بیوی پر منحصر ہوتی

ہے۔شوہر اگر ایک کپ چائے بنا کر پی بھی لیتا ہے تو کہیں نہ کہیں اس چائے کو لے کر طنزیہ لہجہ ضرور استعمال کرتا ہے۔ یہاں انتشار کی وجہ گھر یا بچے نہیں ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کا کیئریر ہوگا۔ بیوی اگر اپنے کام میں ترقی کر رہی ہے تو شوہر اسے شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کی نگاہ میں بیوی کی ترقی باس(Boss) کو خوش رکھنے کی وجہ تلاش کی جاتی ہے۔

بیشتر پڑھے لکھے متوسط گھرانے کے مرد تعلیم یافتہ بیوی کی خواہش تو رکھتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ باہر کام نہ کرے۔ گھر پر رہ کر اپنے بچوں کی پڑھائی کی ذمہ داری لے۔ پڑوس کے بچوں کی ٹیوشن کر لے، یا زیادہ سے زیادہ اسکول یا کالج کی ٹیچر بن جائے، تا کہ گھر کے باہر کم وقت دینا پڑے اور گھر صحیح طریقے سے چل سکے۔ متوسط گھرانے کا شوہر عام طور سے گھریلو ذمہ داری میں شریک ہونے سے کتراتا ہے۔

نوکری کے پیشہ سے وابستہ جوڑے کی پریشانیاں کافی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ گھر چلانے میں میاں اور بیوی کی حصے داری کتنی ہونی چاہیے، یہ موضوع بھی اختلاف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شوہر گھر پہلے پہنچ جائے اور بیوی گھر نہ پہنچ پائے اس پر بھی کشیدگی پیدا ہونے کی گنجائش رہتی ہے۔ ایک پروفیشن سے وابستہ میاں بیوی میں کشیدگی بڑھتے بڑھتے جسمانی تشدد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اکثر ظلم کی وجوہات کی تحقیق میں پہلی اور اہم وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ بیوی پر ہاتھ اٹھا کر اپنی احساس کمتری اور مایوسی کو کسی نہ کسی طرح سے باہر نکالا جاتا ہے۔ کیوں کہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی مزاحمت کرے گی لیکن شوہر کے ظلم کو ظاہر نہیں کرے گی۔ کئی مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ رات میں شدید مار پیٹ کے بعد صبح شوہر بیوی کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتا ہے اور جسم پر سارے لال، نیلے نشان ہونے کے باوجود بھی بیوی فوراً جذباتی ہو جاتی ہے اور اسے معاف کر دیتی ہے۔ یہ سمجھے بغیر کی وہ نہ جانے وہ کتنی بڑی سازش اور کبھی نہ ختم ہونے والے حیرت انگیز کھیل کا مہرا بنتی جا رہی ہے۔

اکثر متوسط گھرانے کی عورتیں یہ دلیل دیتی ہیں کہ ”ہمیں برداشت اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اپنا گھر چھوڑ کر ہم باہر نکل جائیں تو ہمارے ماں باپ، بھائی بہن ہی سب سے پہلے ہماری مخالفت میں ہوں گے۔ والدہ خود کی مثال سے بات ثابت کریں گی کہ انہوں نے بھی خود کی زندگی میں یہی برداشت کیا ہے۔ کم یا زیادہ سبھی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اپنی ہی ماں کو بیٹی کی آواز اٹھانا غلط لگتا ہے۔ سارے افراد کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی بھی قیمت پر وہ سمجھوتہ کرے۔ بہت ہی کم عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر ماں یا بھائی کے سہارے ناسازگار حالات سے خود ہی نبرد آزماں ہوتی ہیں۔ سر پر چھت کی تلاش اور معاشی طور پر خود کفیل ہونا الگ رہنے کی پہلی شرط ہے اور یہ آسان بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عورت صحیح وقت پر فیصلہ کرے۔

ایک پڑھی لکھی عورت کی تکلیف یہ بھی ہوتی ہے "جب تک بیوی بنی رہو تب تک کچھ بگاڑ نہیں ہوتا۔ گھر سنبھالو بچوں کی پرورش کرو سب کچھ بہت صحیح چلتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اپنی شناخت بنانے کی کوشش کرو، چیزیں دوسری شکل اختیار کرنے لگتی ہیں۔"

وہ یہ مانتی ہے کہ آج اس نے جو سمجھ اپنی پہلی پیڑھی یا اپنی ماں کے نقش قدم پر چل کر حاصل کرے گی وہ اس کے لیے زہر آلودہ ثابت ہوسکتا ہے۔ کسی کم تعلیم یافتہ گھریلو عورت کے لیے شوہر اور گھر کی ضرورتوں کے مطابق موڑ لینا بے حد آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس سمجھدار عورت کے لیے نہیں جو اپنی ذہنی قابلیت کے بدولت پر اپنی شناخت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسی لیے ایک سمجھدار عورت کو کئی مورچے سنبھالنے پڑتے ہیں۔

نوکری پیشہ سے وابستہ عورتوں کے پاس ایک متبادل ہوتا ہے لیکن وہاں سماجی تحفظات کے مسائل رونما ہوتے ہیں۔ کسی دوسرے ہمدرد مرد کی طرف یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ بھی پہلے شوہر کی طرح نہ ہوجائے۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ پہلے شوہر جیسا سلوک نہیں کرے گا۔ ایک عورت کے لیے کئی طرح کے ڈر اور بندشیں ہوتی ہیں۔ جس کا فائدہ زیادہ تر شوہر بخوبی اٹھانا جانتے ہیں۔ یہ اچھی طرح جاننے سمجھنے کے بعد بھی کہ اس کی بیوی کے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ وہ بڑی آسانی سے تشدد کے نئے نئے شیطانی حربے ایجاد کرتا رہتا ہے۔

خانگی ظلم کا ایک بے حد باریک حربہ جسے ذہنی تشدد کہا جاسکتا ہے۔ شوہر پانچ سات سال رہنے کے بعد یہ محسوس کرلیتا ہے کہ وہ کس ذات یا کس قسم کی عورت کے ساتھ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اپنی عورت کو سزا دینے کا بہترین نسخہ کیا ہے۔ اسے کس قسم کے اوزار استعمال کرنے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ بیوی پر جسمانی تشدد کا استعمال کر کے یا اسے طمانچہ مار کر وہ اتنی تکلیف نہیں پہنچا سکتا جتنا کہ اسے

نظر انداز کر کے کر سکتا ہے۔ وہ اپنی حکمرانی کا چہرہ محفوظ کر کے ایک سنیاسی کی طرح نظر انداز کرنے کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے ہی گھر میں اس طرح رہتا ہے جیسے اس گھر میں بچے ہیں نوکر ہیں آنے جانے والے مہمان ہیں، اگر نہیں ہے تو صرف اس کی بیوی۔ بیوی کے وجود کو پوری طرح سے نظر انداز کر کے ایک منصوبہ بند طریقے سے وہ اپنی بیوی کو ہلکے زہر کے ذریعے ختم کرنا چاہتا ہے۔ لاتعلقی کو جب تک عورت پوری طرح سمجھ پائے اس سے پہلے وہ پوری طرح اندر سے بکھر چکی ہوتی ہے۔ بہر حال یہ ایک حد تک غیر مناسب رویہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اور وہی عورتیں اسے صحیح طریقے سے سمجھ سکتی ہیں جنھوں نے اس ہلکی موت کو اپنی روح میں گزرتے ہوئے محسوس کیا ہو۔

یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ عورت کی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا کے سارے ملکوں میں کم وبیش ثقافتی اور تہذیبی ردوبدل کے بعد عورت کی حالت مشترک ہے۔ معاشی اعتبار سے خود کفیل عورتوں کو بھی حالات کو سمجھنے اور پرکھنے اور اپنے حقوق کا دعوا کرنے میں تاخیر ضرور ہوتی ہے۔ آخر ایک عورت کو ساری عمر ایک بیوی اور ماں بن کر تا حیات نہیں رہنا ہے۔ اگر اسے سماج میں اپنا مقام حاصل کرنا ہے جس کے لیے اسے ذرائع نہیں مل رہے تو اس کے لیے اسے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔

تشدد کے لیے اٹھے ہاتھ کو روکنا اپنے وقار کو محفوظ رکھنے کی پہلی شرط ہے۔ بہت کم ہی عورتیں ایسی ہوں گی جو پہلی بار خود پر اٹھے ہاتھ کو روک دیں۔ جب شوہر کا ہاتھ مارنے کے لیے اٹھتا ہے تو پرزور مخالفت نہیں کرتیں۔ یہ ایک طرح سے شوہر کو شہ دینا ہے۔ وہ شوہر کی اس حرکت کو شراب کا نشہ یا دفتر کی احساس کمتری یا کسی نامعلوم ناکامی کو تسلیم کر کے اپنی آنے والی پوری زندگی ایک جلاد کے حوالے کر دیتی ہیں۔

جب کہ اسے یہ سمجھانا چاہیے کہ گرچہ اس کی دفتری زندگی بوجھل ہے اور کسی نہ کسی مصیبتوں نے گھیر رکھا ہے۔ لیکن ان وجوہات کی ذمہ دار وہ عورت کو ٹھہراتا ہے اور اس پر کیوں ظلم کرتا ہے۔ وہ گھر کا بے جان فرنیچر، ریڈیو، ٹی وی تو ہے نہیں کہ شوہر جب چاہے سوئچ آن آف کر دے۔

عورت کے لیے خود اعتمادی بہت ضروری ہے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اگر جسمانی تشدد کا نشانہ بنائی جاتی ہے تو ان وجوہات کی ذمہ دار وہ نہیں ہے۔ مرد اپنی صفائی میں پورا بھی

کھاتا کھول کر رکھ سکتا ہے کہ اس کی بیوی میں فلاں فلاں خامیاں ہیں۔آنکھیں بند کر اسے یہ تسلیم کرنے یا احساس کم تری کا شکار ہونے کے بجائے عورت کو اپنا خود کا محاسبہ یا کسی ماہر نفسیات کی مدد لینی چاہیے۔

خود اعتمادی کے لیے سب سے اہم شرط خود کفیل ہونا ہے۔کسی شہر کی رہنے والی متوسط گھر کی ایک پڑھی لکھی ذہین عورت اگر نوکری نہ کر کے صرف گھریلو عورت کی طرز پر اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنے پیر پر کلہاڑی مارتی ہے۔کیوں کہ بیشتر شوہر ایسے بہت کم ہیں جو کل وقتی ہاؤس وائف کو اس کی توقعات کے مطابق حق دے پائیں۔متوسط طبقے کی عورتوں کے لیے سماج اور شوہر کی نظروں میں قدر و منزلت حاصل کرنے کی پہلی سیڑھی ہے معاشی اعتبار سے خود کفیل ہونا۔اس کے بعد ہی وہ اپنی شرطوں پر زندہ رہنے کی بات سوچ سکتی ہے۔

کئی مرتبہ صرف دھمکی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔اکثر بیوی گھریلو کشیدگی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی بات دہراتی ہے۔کچھ دنوں کے بعد شوہر یہ اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ بیوی کا یہ کہنا صرف گیدڑ دھبکی ہے۔اور اس کی بیوی کے پاس کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے تو اس کے ظلم میں مزید اضافے کا سبب بنتا ہے۔

شوہر بیوی کے درمیان جسمانی تشدد کے شکار سب سے زیادہ معصوم بچے ہوتے ہیں۔بچپن سے ہی وہ دہشت زدہ ماحول میں بڑے ہوتے ہیں۔یہ ماحول کسی نہ کسی طرح سے بچے کی ذہنی نشو نما کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے۔اسی لیے زیادہ تر عورتیں شوہر کا ظلم اس لیے برداشت کرتی ہیں کہ نام ہی کے لیے باپ کا سایہ بچوں پر بنا رہے ایسا سوچنا غلط ہے۔غیر مناسب کشیدہ ماحول بچوں کی نشونما میں ہمیشہ کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے جو بچوں کو منشیات، ڈرگس جیسی ذہنی مہلک بیماری کی جانب دھکیل دیتا ہے۔

ظالم شوہر کو اس کی بری عادتوں سے باہر نکلنا ایک گول دائرے سے راستہ تلاش کرنے کے مانند ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ بیوی اپنے ذہن میں ناامیدی اور احساس کمتری کو بالکل جگہ نہ دے۔کوئی بھی فوری فیصلہ لینے سے پہلے بیوی کو مناسب حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ہر مشکل کا طے شدہ کوئی حل نہیں ہوسکتا۔مشکل حالات سے نمٹنے کا طریقہ کار جدا جدا ہوسکتا ہے لیکن

عورت کو اپنی ذاتی مایوسی سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ تا کہ بچوں کو ظلم وستم کی تپش سے بچایا جا سکے۔

ڈاکٹر جان گرے کی کتاب "Men are from Mars,women are from Venus" میں اپنے ذاتی تجربات کا ذکر کیا ہے کہ ایک اچھی ازدواجی زندگی کس طرح خوشی خوشی چل سکے۔ حیرت ہوتی ہے کہ امریکہ اور یورپ یا کسی بھی ممالک کی ازدواجی زندگی سے متعلق مسائل میں کتنی ہم آہنگی ہے۔

آج عالمی سطح پر گھر ٹوٹ رہے ہیں۔ امریکہ میں آٹھ نو سال کے بچے خودکشی پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بڑے شہروں کی ساری کشیدگی کے باوجود کوئی حل تلاش کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

میری سب سے بڑی شکایت اسکولوں اور کالجوں کی غیر ضروری تعلیمی طریقے کار سے ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں بھاری بھر کم کتابوں کے بوجھل نصاب میں زندگی بسر کرنے کی عملی تربیت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ طلبہ کو ہم فزکس، جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، لنگویسٹک اور ادب میں شیکسپیئر سے لے کر مہادیوی ورما کی نظمیات تک کی ہر قسم کی تعلیم دینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ کانونٹ اسکولوں میں مورل سائنس یا مذہبی رواداری کے لیے جگہ بنائی گئی ہے۔ اسکولوں میں ٹوٹے ہوئے گھروں کے بچوں کے لیے ٹرینڈ کاؤنسلر کو تعینات کیا گیا ہے۔ لیکن ''علاج سے بہتر بچاؤ'' کے نظریے کے مطابق ہمیں چاہیے کہ کالج میں جس طرح ہم اپنی طلبات کو نصاب کی کتابوں کے ذریعے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے قابل بناتے ہیں۔ اسی طرح انھیں اپنے حقوق کے شناخت اور مطالبات کی بھی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے۔

یہ بہت ضروری ہے کہ ہم نوجوان لڑکیوں کو زندگی بسر کرنے اور خوداعتمادی کی عملی تعلیم اور تہذیب سے روشناس کرائیں۔ انھیں اپنی ایک پہچان دینے کی کوشش کریں۔ انھیں بتائیں کی وہ دہلیز پر پڑی ہوئی جوتوں کی جوڑی نہیں ہیں۔ جسے مرد جب چاہے اپنے پیروں میں سجا کر چل دے اور جب چاہے گھر کے کسی دھول آلودہ جگہ پر پٹک دے۔ جس طرح کی تہذیب ہماری متوسط گھرانے کی لڑکیوں کو اپنے گھر کے دقیانوسی ماحول سے برابر ملتی رہتی ہے۔ جس طرح سے صبر وتحمل کی گھٹی انھیں پیدا ہوتے ہی پلا دی جاتی ہے۔ اسے پوری طرح نظر انداز کرتے ہوئے اپنی

آنے والی نسل کو عزت وعظمت کے ساتھ سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنائیں ۔آخر میں ایک چھوٹی سی مثال پیش خدمت ہے۔

سائنسدان کیڑے مکوڑے اور چرند و پرند پر کچھ تجربات کرتے ہیں ۔ایک سائنسدان نے دو مینڈک لیے ۔ایک مینڈک کو اس نے کافی گرم پانی میں چھوڑا۔گرم پانی کا درجۂ حرارت برداشت سے باہر ہونے کے سبب وہ فوراً کود کر باہر آ گیا۔اب اس نے دوسرے مینڈک کو سرد پانی میں ڈالا مینڈک اس میں آرام سے اچھلتا کودتا رہا ،اس نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی ۔سائنسدانوں نے آہستہ آہستہ پانی کا درجہ حرارت بڑھایا۔اور یک دم گرم کر دیا۔مینڈک اس گرم درجہ حرارت کا آہستہ آہستہ خوگر ہو گیا۔اور جب اس کا جسم گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکا تو فوت ہو گیا۔

خواتین کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔عرصہ دراز سے ان کو خوگر کیا گیا ہے۔وہ ہر طرح کی حرارت سے اس قدر خوگر ہو جاتی ہیں کہ ایک نئے گھر کے نئے ماحول میں نئے لوگوں کے درمیان آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتی ہیں ۔آخر کار یہ سمجھوتہ ان کے مانگ میں بھرے ہوئے سندور کی ارتھی تک دکھائی دیتا ہے۔

لیکن آج وقت نے کروٹ بدلی ہے ۔تمام عورتیں مرتی نہیں ،وہ دیر سے ہی سہی بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کو پہچان جاتی ہیں ۔خطرے کی آہٹ کو سن رہی ہیں اپنے زندہ ہونے کی اہمیت کو سمجھ پا رہی ہیں ۔ذہنی تشدد اور مخفی ظلم کی شناخت کر کے ان پر سوالات قائم کرتی ہیں اور باہر آنے کا حوصلہ بھی دکھاتی ہیں۔اپنی کھوئی ہوئی عزت وعفت کو دوبارہ سنوارتی ہیں ۔

اس طرح وہ اپنی زندگی سنوارنے والی عورتوں کے کارواں میں شامل ہوتی ہیں۔اور یہ کارواں دن بہ دن بڑھتا جائے گا۔اس میں شک نہیں ۔

Women Empowerment آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے غیر ضروری درجۂ حرارت سے فرار اور اس سے وابستہ خواتین کی حسرتوں کو ختم کرنے اور انھیں بیدار کرنے اور ایک پہچان دینے کے عمل کا نام ہے۔

• • •

کہانی

انا پورنا منڈل کا آخری خط

پیاری ماں اور بابا

آداب

مجھے معلوم ہے بابا لفافے پر میری خوش خطی دیکھ کر لفافے کو کھولتے ہوئے تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے۔ آپ بہت احتیاط کے ساتھ لفافہ کھولو گے کہ اندر رکھا ہوا میرا خط پھٹ نہ جائے۔

سوچتے ہو گے کہ ایک سال بعد میں آپ لوگوں کو خط کیوں لکھنے بیٹھی ؟ کبھی آپ اپنے ڈاک خانے سے، کبھی 'بلا' یا 'باؤدی' اپنے دفتر سے فون کر ہی لیتے ہیں پھر خط لکھنے کی کیا ضرورت۔ ڈرو مت ایسی کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ کچھ نیا ہو بھی کیا سکتا ہے۔

بس یہی ہوا کہ پچھلے ایک ہفتے سے میں خود کو بار بار آپ لوگوں کو خط لکھنے سے روکتی رہی۔ کیوں؟ بتا رہی ہوں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ بمبئی میں برسات کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ میں تو یہ دعا کر رہی تھی کہ برسات میں زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو لیکن وقت سے پہلے ہی شروع ہو گئی اور مجھے جس بات کا خوف تھا وہی ہوا۔ اس مرتبہ پارک کی گیلی مٹی سے بھری سڑک سے اٹھ کر لال کیچوؤں کی فوج گھر کے اندر آ گئی۔ گھر میں جاؤ تو یہ کیچوؤے موری سے اوپر منھ دکھا دکھا کر جھانکتے ہیں۔ نہانے جاؤ تو بالٹی کے نیچے کونوں پر وہ بے خوف چپکے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اچانک سے پیروں کے نیچے کچھ پلپلا سا محسوس ہوتا ہے۔ اور میں ڈر جاتی ہوں کہ کہیں میرے پاؤں کے نیچے آ کر کوئی کیچوا مر تو نہیں گیا۔؟

اس بار مجھے وہ باں کڑ کا '' دیکھو اب بھی وہی گھر اپنا لگتا ہے''۔ گھر بہت یاد آیا۔ بس یہ

یادیں ہی تمہارے ساتھ بانٹنا چاہتی تھی۔ پتا نہیں تمیں یہ یاد ہے یا نہیں، پتا نہیں ببلا کو یاد ہو یا نہیں، ہم کتنی بے صبری سے برسات کے آنے کا نتظار کرتے تھے۔ موسم کی پہلی برسات دیکھ کر ہم کیسے اچھلتے کودتے، ماں کو بارش کی آنے کی خبر دیتے۔ جیسے پانی کی بوندیں صرف ہمیں ہی دکھائی دیتی ہیں اور کسی کو نہیں۔ پتوں پر ٹپ ٹپ بوندوں کی آواز اور اس کے ساتھ ہوا میں دمکتی پھیلتی مٹی کی مہک ہمیں پاگل کر دیتی تھی۔ ہم اخبار کو کاٹ کاٹ کر کاغذ کی ناؤ بناتے اور انھیں تالاب میں چھوڑتے۔ ماں آنکھیں دکھاتی رہتی اور ہم سارا دن پوکھر کے پاس اور آنگن کے باہر ہاتھ میں نمک کی پوٹلی لیے برساتی کیچوؤں کو ڈھونڈتے رہتے تھے۔ وہ ادھر اُدھر بلبلاتے ہم سے چھپتے پھرتے تھے۔ اور ہم انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارتے تھے۔ نمک ڈالنے سے ان کا لال رنگ کیسے بدلتا تھا۔ کیچوئیں ہلتے تھے اور ان کا جسم سکڑ کر رسی ہو جاتا تھا۔ ببلا اور مجھ میں ہوڑ لگتی تھی کہ کس نے کتنے زیادہ کیچوؤں کو مارا۔ ببلا تو ایک ایک کیچوئیں پر مٹھی بھر بھر کر نمک ڈال دیتا تھا۔

ماں مجھے یاد ہے آپ کتنا چلاتی تھیں ببلا پر ”اتنا نمک ڈالنے کی کیا ضرورت ہے رے کھوکا“؟ پر ہر بار جیت ببلا کی ہی ہوتی تھی۔ اس کے مارے ہوئے کیچوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ بابا تم ڈاک گھر سے واپس آتے تھے تو پوچھتے تھے ”تم دونوں قاتلوں نے آج کتنے کیچوؤں کا قتل کیا“؟ پھر مجھے اپنے پاس بٹھا کر سمجھاتے ”ببلا کی نقل کیوں کرتی ہے رے“ تو تو ماں انا پورنا ہے۔ دیوی کی طرح ہے۔ تجھے کیا ان بے زبان جانورں کو مارنا زیب دیتا ہے! بھگوان پاپ دے گا رے!“ آج مجھے لگتا ہے بابا آپ ٹھیک کہتے تھے۔ قتل چاہے انسان کا ہو یا جانور کا قتل تو قتل ہوتا ہے۔

تو کیا بابا اس پاپ کی سزا یہ ہے کہ باں کڑ کے بانس پور سے چل کر اتنی دور بمبئ کے اندھیری علاقے کے مہا کالی کیوس روڈ کے فلیٹ میں آنے کے بعد بھی وہ سب کیچوئیں مجھے گھیر کر ڈراتے ہیں جسے ’پوکور‘ کے آس پاس نمک چھڑک کر میں نے مار ڈالا تھا۔

یہ میری شادی کے بعد کی پانچویں برسات ہے۔ برسات کے ٹھیک پہلے ہی تم نے میری شادی کی تھی۔ جب باں کوڑ سے بمبئ کے لیے روانہ ہوئی تم سب کی نم آنکھوں میں کیسے دیے ٹمٹا رہے تھے۔ جیسے آپ کی بیٹی نہ جانے کون سے پری لوک جا رہی تھی۔ جہاں جنت کی پریاں اس کا خیر مقدم کرنے لیے پھول کی تھال لیے کھڑی ہوں گی۔ یہ جنت جو آپ لوگوں نے نہیں دیکھی

تھی۔ پر تمہاری بیٹی کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کی جھولی میں آ گرا تھا۔ ورنہ کیا انا پورنا اور اس کے ڈا کیا بابو شیبو بورڈ کی اوقات کیا ہے کہ انھیں ریلوے کی مستقل نوکری والا سدرشن لڑکا ملتا۔ تم دونوں اپنے جمائی راجہ کو دیکھ دیکھ کر پھلوے نہیں سما رہے تھے۔ کہ مجھے بی اے کی سالانہ امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا اور دوسرے درجے کی ڈولی میں بٹھا کر وداع کر دیا۔

جب میں نے اس پرستان کے دروازے دادر اسٹیشن پر قدم رکھا تو محسوس ہوا تلاب میں تیرنا بھول گئی ہوں۔ اتنے آدمی تو میں نے پورے گاؤں میں نہیں دیکھے تھے۔ یہاں اسٹیشن کے پل کے ہجوم کے ساتھ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے لگا جیسے پیڑ کے سوکھے پتوں کی طرح ہم سب ہوا کے بہاؤ کی جانب بہہ رہے ہیں۔ دیہاتی لال ساڑی میں تمہاری زندگی بھر کی جمع پونجی کے گہنے اور کپڑوں کا بکسا لیے، جب اندھیری کی ٹرین میں ان کے ساتھ بیٹھی تو ساتھ بیٹھے لوگ مجھے ایسے گھور رہے تھے۔ جیسے میں اور ببلا اکثر و بیشتر کلکتہ کے چڑیا گھر میں ون مانوس کو گھورتے تھے۔ اور جب مہا کالی کیوس روڈ کے گھر کا جنگ کھایا تالا کھلا تو جانتے ہو، سب سے پہلے دہلیز پر میرا خیر مقدم کس نے کیا تھا۔ دہلیز کی پھانکوں میں سمٹتے سرکتے گردن اچکاتے لال لال کیچوؤں نے۔ اس دن میں بہت خوش تھی مجھے لگا میرا اباں کڑا میرے آنچل سے بندھا بندھا میرے ساتھ چلا آیا ہے۔ میں مسکرائی تھی۔ پر میرے شوہر انھیں دیکھتے ہی خوف زدہ ہو اٹھے۔ انھوں نے چپل اٹھائی اور چٹاخ چٹاخ سب کو روند ڈالا۔ ایک ایک وار میں انھوں نے سب کا کام تمام کر ڈالا تھا۔ تب میرے دل میں ان کیچوؤں کے لیے پہلی بار ممتا ابھر آئی تھی۔ انھیں اس طرح کچلتے ہوئے دیکھنا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

دس دن ہمیں اکیلا کر کے آخر کار ان کی ماں اور بہن بھی اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔ اب ہم مطبخ میں پردہ ڈال کر سونے لگے تھے۔ کچن کی موری لاکھ بند کرو یہ کیچوئیں آنا بند نہیں کرتے تھے۔ شوہر ریلوے کی ڈیوٹی پر سفر میں ہوتے اور میں کچن میں۔ اور مطبخ میں بے شمار کیچوئیں تھے۔ مجھے احساس ہوتا تھا میں نے اپنی ماں کی جگہ لے لی ہے۔ اور مجھے ساری زندگی مطبخ کی ان دیواروں کے بیچ ان کیچوؤں کے ساتھ گزارنا ہے۔ ایک دن ایک کیچوا میری نگاہ سے بچ کر مطبخ سے باہر چلا گیا۔ اور ساس نے اسے دیکھ لیا۔ ان کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ انھوں نے چائے کی

گرم پانی کی کیتلی اٹھائی اور مطبخ میں بلبلاتے سب کیچوؤں پر گالی دیتے ہوئے ابلتا پانی ڈال دیا۔ سچ مانو بابا میرے پورے جسم پر جیسے پھپھولے پڑ گئے تھے۔ جیسے ابلتا ہوا پانی ان پر نہیں مجھ پر ڈالا گیا ہو۔ وہ سب فوراً مر گئے ایک بھی نہیں بچا۔ لیکن میں زندہ رہی۔ مجھے اس وقت سمجھ آیا کہ 'باں کڑ' کے بنا زندہ رہنا ہے۔ پر ایسا کیوں ہوا بابا کہ مجھے کیچوؤں سے ڈر لگنے لگا۔ اب وہ جب بھی آتے ہیں میں انھیں واپس موری میں کر دیتی ہوں پر مارتی نہیں۔ ان دنوں میں نے یہ سب خط میں لکھا تو تھا پر آپ کو میرے خط کبھی ملے ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے یہ بھی نہ ملے یا مل بھی جائے تو آپ کہو کہ نہ ملا۔ فون پر میں نے پوچھا بھی تھا۔ ''خط ملا'' آپ نے غیر یقینی طور سے پوچھا پوسٹ تو کیا تھا یا نہیں؟ میں ہنس دی تھی۔ اپنے پاس رکھنے کے لیے تو نہیں لکھا تھا۔ آپ نے آگے کچھ نہیں کہا اور بات ختم۔

فون پر اتنی باتیں کرنا آسان کہاں ہے۔ فون کے تاروں پر میری آواز جیسے ہی آپ تک تیرتی ہوئی پہنچتی ہے۔ آپ کو لگتا ہے سب ٹھیک ہے۔ جیسا میرا زندہ ہونا ہی میرے ٹھیک ہونے کی نشانی ہے اور فون پر آپ کی آواز سن کر میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ کیوں کہ میں فون پر آپ کو بتا نہیں سکتی کہ آپ جس آواز کو میری آواز سمجھ رہے ہو وہ میری نہیں ہے۔ آپ فون پر میری سلامتی ہی سننا چاہتے ہو۔ اور میں کیچوؤں کے بارے میں آپ کو کیسے بتا سکتی ہوں؟ آپ کی آواز سے میں چاہ کر بھی لپٹ نہیں سکتی۔ مجھے تب سترہ سو کلومیٹر کا فاصلہ بہت کھلنے لگتا ہے۔

اتنی لمبے فاصلے کو پار کر ڈیڑھ سال پہلے جب میں باں کڑ پہنچی تھی، مجھے یہ احساس ہوا تھا میں کسی اجنبی گاؤں میں آ گئی ہوں جو میرا نہیں ہے۔ مجھے واپس جانا ہی ہے۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی نہیں ملی۔ میں نے بے دلی سے یہ خبر دی تھی کہ میں تیسرے مہینے سے ہوں۔ میں آگے کچھ بولتی کہ آپ سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ماں نے مجھے گلے لگا لیا تھا۔ باؤدی نے ماتھا چوم لیا تھا۔ میں روئی تھی، چیخی تھی، میں نے منتیں کیں تھیں کہ مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے، کہ اس گھر میں بچے کی کلکاریاں سسکیوں میں بدل جائیں گی، پر آپ لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپ لوگ مجھے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ بھلا پہلا بچہ کوئی بھی گراتا ہے، پہلے بچے کو گرانے سے حمل ٹھہرتا ہی نہیں، ماں بننے سے ہی عورت مکمل ہے۔ ماں بننے کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے عورت کو جینے کی وجہ مل جاتی ہے۔ ماں

آپ مجھے اپنی طرح دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے آپ کی بات مان لی اور سبھوں کے خوابوں کو پیٹ میں سنبھال کر واپس لوٹ آئی۔

واپس اسی مہا کالی کے غار والے فلیٹ میں انہیں کیچوؤں کے پاس۔ بس فرق یہ تھا کہ اب وہ باہر فرش سے الگ ہو کر میرے جسم میں رینگ رہے تھے۔ نو مہینے میں اپنے پیٹ میں ایک دہشت زدہ شکل کو لیے ہوئے محسوس کرتی رہی۔ پانچویں مہینے میرے پیٹ میں جب اس شکل نے ہلنا شروع کیا۔ میں ڈر سے کانپنے لگی تھی۔ مجھے لگا میرے پیٹ میں وہی برساتی کیچوئیں رینگ رہے ہیں، سرک رہے ہیں۔ آخر وہ گھڑی بھی آئی، جب انھیں میرے جسم سے باہر آنا تھا۔ اور سچ ماں، جب لمبی بے ہوشی کے بعد میں نے آنکھ کھول کر اپنی بغل میں سلوٹوں والی چمڑی لیے ہوئے اپنی جڑواں بیٹیوں کو دیکھا۔ میں سہم گئی۔ ان کی شکل اسی طرح گج گجی لال کیچوؤں کی مانند جھری دار تھی۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا دیکھو تو ماں یہ دونوں کتنی بدشکل ہیں۔ پتلے پتلے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ پیر اور سانولی مرجھائی سی۔ آپ نے کہا تھا بڑی بے کار ہے رے تو، کیسی باتیں کرتی ہے، یہ تو خود لچھمی سرسوتی ایک ساتھ آئیں ہیں تیرے گھر۔ آپ سب نے کلکتہ جا کر اپنی بیٹی اور جمائی بابو کے لیے کتنی خریداری کی تھی۔ 'باوَدی' نے خاص سونے کا سیٹ ارسال کیا تھا۔ سب دان دہیز سمیٹ کر آپ یہاں آئی اور چالیس دن میری، ان دنوں سسرال والوں کی خدمت گزاری کر کے لوٹ گئی۔ ان لچھمی سرسوتی کے ساتھ مجھے باندھ کر آپ تو بانس پور لوٹ گئی مجھے بار بار یہی سننا پڑا ایک کپال کنڈلا کو اسپتال بھیجا تھا دو کو اور ساتھ لے آئی۔

بابا کبھی من ہوتا تھا ان دونوں کو باندھ کر آپ دونوں کے پاس پارسل بھیجوا دوں کہ مجھ سے ان دونوں کی دیکھ ریکھ نہیں ہو پاتی۔ اپنی یہ لچھمی سرسوتی سی نا تنیں آپ ہی کو مبارک ہوں۔ لیکن ہر مرتبہ ان کی ٹک ٹک کرتی آنکھیں مجھے روک لیتی تھیں۔

ماں مجھے ایسا کیوں احساس ہوتا ہے کہ آپ کی طرح میں ایک اچھی ماں کبھی نہیں ہو پاؤں گی۔ جو زندگی بھر مطبخ کی چہار دیواری میں بلا اور میرے شوہر کے لیے پکوان بناتی رہی اور فالج کی ماری ٹھاکر ماں کی چادریں دھوتی رہی سمیٹتی رہی۔ تمہاری نواسیوں کی آنکھیں وہ مانگتی ہیں۔ جو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں انھیں کبھی نہیں دے پاؤں گی۔

ان پانچ سات مہینوں میں کب دن چڑھتا ہے کب رات ڈھل جاتی ہے مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا۔اس مرتبہ کی برسات نے آ کر میری آنکھوں پر چھائے سارے پردے گرا دیے ہیں۔ یہ دونوں سرکنا سیکھ گئی ہیں۔ سارا دن کیچڑ مٹی میں کیچوؤں سے کھیلتی رہتی ہیں۔ جب یہ دونوں سرکتی ہیں۔ مجھے کیچوئیں رینگتے دکھائی دیتے ہیں اور سڑک پر میدان کے پاس گیلی مٹی میں کچوؤں کو سرکتے دیکھتی ہوں تو ان میں ان دونوں کی شکل دکھائی دیتی ہے۔ کہیں میرے شوہر گھر میں داخل ہوتے ہی ان پر چپلوں کی مار نہ شروع کر دیں یا میری ساس ان پر کیتلی کا کھولتا ہوا پانی نہ ڈال دیں۔ میں جانتی ہوں یہ میرا وہم ہے پر یہ لاعلاج ہے اور میں اس وہم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

ان دونوں کو اپنے پاس لے جا سکو تو لے جانا۔ 'بلا اور باؤدی' شاید انھیں اپنا لیں۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ بڑی ہونے پر یہ دونوں اگر آسمان چھونا چاہیں تو یہ جانتے ہوئے کہ وہ آسمان کبھی چھو نہیں پائیں گی انھیں روکنا مت۔ ان دونوں کی شکل میں تمہاری بیٹی سود سمیت واپس لوٹا رہی ہوں۔ ان میں آپ مجھے دیکھ پاؤ گے شاید۔ بابا آپ کہتے تھے نا روحیں کبھی نہیں مرتیں۔ اس بڑی خلاء میں وہ تیرتی رہتی ہیں۔ بہت پرسکون ہو کر۔ میں اس سکوت کو چھو لینا چاہتی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں بابا۔ ہر جسم کی تھکنے کی اپنی حد ہوتی ہے۔ میں جلد تھک گئی، اس میں جرم میرا ہی ہے۔ آپ دونوں مجھے معاف کر سکو تو مجھے معاف کر دینا۔

تمہاری فرماں بردار بیٹی

انا پورنا منڈل

• • •

خانگی تشدد سے نمٹنے کی پہلی شرط: خود کفیل ہونا

12 مارچ 2007 کو بھوپال کے بھارت حال میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا۔''خوداعتمادی''،جس میں ہندوستانی زبانوں کی شاعرات شریک تھیں۔اُڑیا زبان کی شاعرا اپچتا مشر نے اپنی ایک بہترین نظم کا انگریزی ترجمہ سنایا تھا جس کا ترجمہ میں نے ہندوستانی زبان میں کر دیا۔وہ نظم اس طرح ہے۔:

ہر سال جتنے درخت کٹتے ہیں
اس سے زیادہ کٹتی ہیں عورتیں
وہ ایک درخت تھی
ایک درخت سے شناسائی کے لیے
خود کو درخت بننا پڑتا ہے
اس کی خرخراہٹ کو چھونے کے لیے
اپنے سائے کا سہارا لینا پڑتا ہے
پہلی بار جب میں اس سے ملی
اس نے مجھے کس کر پکڑا اور خوب روئی
اس نے مجھے بتایا
کہ انھوں نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر
اپنے آنگن میں لگایا
تاکہ وہ چھایا اور حفاظت کر سکے
دوسری بار میں جب اس سے ملی
وہ میرے کندھے سے لگ کر

ایک بار پھر روئی
وہ روئی سسکی اور اس نے کہا
میں نے سب کچھ دینے کی کوشش کی
چھایا، حفاظت، محبت، خوشبو
پر انھیں کچھ اور چاہیے تھا
انھوں نے میرے پتے گنے
اور انھیں پیسے سے تولا
پھر اور پیسے کی مانگ کی
اس سے بھی زیادہ میرے پاس پتے تھے
تیسری بار جب میں اس سے ملنے گئی
وہ جا چکی تھی وہ نہیں تھی
اسے کاٹ ڈالا گیا تھا اور
اسے آلاؤ میں جلا ڈالا تھا
اس میں انھوں نے اپنے گیلے ہاتھ سیکے اور سکھائے
ان کے ہاتھوں پر خون کا قتل کا
ایک بھی نشان نہیں تھا
ہر سال جتنے درخت کٹتے ہیں
اس سے زیادہ کٹتی ہیں عورتیں
سبھی کٹی ہوئی عوتیں آلاؤ میں استعمال نہیں ہوتیں
کچھ کو بنا دیا جاتا ہے بیسا کھیاں
ورنہ یہ وکلانگ اپنگ معاشرہ
بنا کسی سہارے کیسے کھڑا ہوتا ہے
سچیتا مشر

یہ سچ ہے کہ جہیز کے نام پر شوہر کی کسی مایوسی کے تحت عورتیں قسم قسم کے تشدد کا شکار ہوتی ہیں ۔ اگر عورت کو اسپتال لے جانا ہو تو وہ وہاں بہانے بنانے لگتی ہے کہ غسل کھانے میں پھسل کر گر پڑی یا نہا کر اٹھتے وقت نل سے سر ٹکرا گیا ۔ یہاں تک کہ مٹی کا تیل چھڑک کر اپنے کو آگ لگا لینے یا جلا دیے جانے پر بھی نوّے فیصد جلی ہوئی عورتیں دم توڑتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی یا بیٹے کو دیکھ کر قاتل شوہر کو بچانے کے لیے اسٹو کے پھٹنے کی کہانی گڑھ کر سچائی سامنے نہیں آنے دینا چاہتی تا کہ بچے کے سر پر باپ کا سایہ برقرار رہے ۔

ظلم کی شکل اگر قتل تک نہیں بھی پہنچتی تو بھی لڑکیاں برداشت اور سمجھوتہ کر کے گھر چلانے کی طاقت رہنے تک اپنے گھر خاندان کے لوگوں کو اپنی تکلیف کی خبر نہیں لگنے دیتیں ۔ انھیں یہ احساس رہتا ہے ماں باپ نے شادی کر کے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ۔ اب آگے کی زندگی کا دار و مدار ان پر ہے ۔ انھیں اپنے دم پر گزر بسر کرنی ہے ۔ کسی بھی شہر میں قصبہ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے ۔

''انا پورنا بورڈ کا آخری خط'' اسی ذہنیت سے متعلق لکھا ہوا ہے ۔ یہ کہانی میں نے پچیسیوں بار'' کہانی سمیناروں میں حقوق خواتین کے اداروں میں پڑھ کر سنا چکی ہوں ۔ ہر مرتبہ یہ سوال کیا جاتا ہے ۔ کہ یہ کہانی کسی سچے واقعات کی ترجمانی کرتی ہے کیا ۔ پچھلی پیڑھی کی عورتوں کو معلوم پڑتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ان کا حصہ اس میں ضرور ہے ۔ اس کہانی میں وہ اپنے کو تلاش کرتیں ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ اس کہانی کی کڑی مجھے ایک حقیقی واقعات سے ملے ۔

1994 کی بات ہے ۔ مغربی بنگال کے ایک چھوٹے گاؤں سے ایک بزرگ ہمارے ادارے ''ہیلپ'' میں آئے تھے ۔ انھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ممبئی میں کی تھی اور بیٹی نے اپنی ایک سال کی بچی کو چھوڑ کر تیسری منزل سے کود کر خودکشی کر لی ۔ انھیں اس حادثے کی خبر فوراً نہیں ملی تھی ۔ انھیں شک تھا کہ ان کی بیٹی کو جہیز کی لالچ میں مار ڈالا گیا ہے ۔ اس کا کوئی پختہ ثبوت ان کے پاس نہیں تھا ۔ شک کی وجہ بتاتے ہوئے انھیں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی خوبصورت بیٹی کی تحریر میں لکھے ہوئے خطوط کا پلندا ہمیں دیا ۔

ان خطوط نے مجھے بے حد پریشان کیا تھا ۔ وہ کاؤنسلنگ کے شروعات کے دن تھے ۔ میں بہت تجربہ کار نہیں ہوئی تھی ۔ اس لیے مجھے ہر معاملہ پریشان کر دیتا تھا ۔ ان خطوط کو لکھنے والی بے

حد حساس لڑکی کے کردار کا روم روم اس کے خطوں کی سطروں میں میرے سامنے بکھرا تھا۔ایک ایک سطر گواہ تھی کہ لڑکی ماں باپ کی فرماں بردار اور لاڈلی تھی۔مغربی بنگال کے ایک چھوٹے سے قصبے سے نکل کر ممبئ جیسے بڑے شہر میں ایک مستقل نوکری والا خوبصورت رشتہ اور اپنی اوقات سے بڑا گھر دیکھ کر، اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر اس نے ماں باپ کا دل رکھنے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی شادی کر لی تھی۔پھر بھی اس کے پاس اپنے کچھ خوبصورت خواب تو تھے ہی۔جو شادی سے پہلے ہر لڑکی کے خیال سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن جب خواب سے نکل کر حقیقت سے واقف ہوتی ہیں، اسے یہ سمجھ آجاتا ہے کہ شادی کے بعد اسے اپنے حالات سے خود نبرد آزماں ہونا ہے۔اور اپنے ذاتی مشکلات سے والدین کو پریشان نہیں کرنا ہے۔لیکن کچھ تھا جسے وہ ہر حال میں بانٹنا چاہتی تھی۔اس کے خطوں میں اس کے چھوٹے سے قصبے کی سکھی سہیلیوں کی، تالاب اور مچھلی کی باغیچے کے پھولوں اور جھولوں کی یادیں رلاتی اور بڑے شہر ممبئ کے ماحول کا کرب زدہ بیان تھا۔ہر خط میں مستقل ایک پوشیدہ بات تھی جسے سمجھنے سے قاصر والدین نے نہ اسے بلایا نہ خود اس سے ملنے آئے ایک چھوٹے سے قصبے سے بڑے شہروں میں آئی کتنی لڑکیاں ہوگی جو اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کے والدین تکلیف زدہ ماحول سے سمجھوتہ نہ کرنے کے بارے میں نہیں سننا چاہتے۔بلکہ خوش گوار ماحول ہی سننا چاہتے ہیں۔ظاہر ہے ان خطوط کے ذریعے کوئی قانونی کاروائی نہیں کی جاسکتی تھی کیوں کی ان خطوط میں صاف طور سے کسی بھی طرح کے ظلم و تشدد کی بات نہیں تھی۔اس بوڑھے باپ اور اس بھائی کی کوئی مدد نہیں کی جاسکی۔پر اس لڑکی کے بنگلہ زبان میں لکھے خط مجھے کافی وقت تک بے چین کرتے رہے۔

کچھ سال بعد میں اس کی کہانی لکھنا چاہتی تھی۔پر لکھ نہیں پا رہی تھی۔سپاٹ تکلیف کا بیان ایک رپورٹ ہو جاتی ہے۔اور وہ دیرپا اثر نہیں قائم کرتی۔دکھ اور غم کے مرکبات کو پڑھنے والے یا سننے والے کے ذہن میں اترنے کے لیے ایک بے حد کارگر علامت کی ضرورت تھی۔تبھی ایک دن اپنی ایک پرانی کہانی ''مہانگر کی میتھلی'' کا شیل کالونی چمبور والا گھر میرے دماغ میں آیا۔جہاں بارش کے دنوں میں موری سے مسلسل نکلتے کیچوؤں میں پریشان رہتی تھی۔بغیر ریڑھ کی ہڈی والے پلپلے کیچوے مجھے دہشت سے بھر دیتے تھے۔کیچوؤں میں دکھ گہرا ہوتا دکھائی دیا۔پوری

کہانی میں کیچوؤں کا نشان مسلسل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔میرا وہ چھبور والا گھر مہا کالی کیوس روڈ کا وہ کمرہ بن گیا۔ جہاں بیٹھ کر اناّ پورنا بورڈ نے اپنا آخری خط اپنے ڈاکیے باپوشیبومنڈل کے نام لکھا۔جیسے ہی بارش اور کیچوؤں کا ساتھ ملا۔کہانی ایک بیٹھک میں لکھ لی گئی۔ڈاکٹر پربھاکران دنوں ''وگرتھ'' کے مدیر تھے۔اور''کتھا سمیہ'' کے لیے کہانی کا برابر اصرار کر رہے تھے۔یہ کہانی بہت چھوٹی تھی۔میں نے بہت پس و پیش کے ساتھ اسے ایک اور چھوٹی کہانی کے ساتھ بھیج دیا۔انھوں نے پڑھنے کے فوراًبعد فون کیا۔''اس ایک کہانی کے بعد کسی اور کہانی کی ضرورت نہیں رہ جاتی اس لیے دوسری نہیں لے رہا''۔''وگرتھ''میں ہی بڑے افسانہ نگار مُدراچھس نے اس کہانی کا تفصیلی تجزیہ کیا۔تو میں نے بھی نئے سرے سے کہانی کو سمجھا۔لکھتے وقت شاید میرے ذہن میں بھی اتنے معنی ایک ساتھ وانہیں ہوئے تھے۔

دہلی کے آنند گرام''سنسکرتی سینٹر''میں ویمنس ورلڈ کی ورکشاپ میں جب اس کہانی کو پڑھ کر سنایا تو لکھنؤ کی شاعرہ عذرا پروین اور افسانہ نگار غزال ضیغم کے آنسوؤں نے بھی مجھے ہلا دیا۔اس کہانی کا ترجمہ پنجابی میگزین''موہوندرا'' کے جنوری تا مارچ 2004 کے شمارے میں جیسے ہی آئی چنڈی گڑھ کے نکڑ ناٹکوں کے جانے مانے مشہور معروف ڈراما نگار'گُر وشرڑ سنگھ' نے' ٹانی مارسن' کی کہانی اور اسے شامل کر 8 مارچ 2004 کو ویمنس ڈے کے دن ایک ڈرامہ پلے کیا گیا۔باں کڑ کی اس لڑکی کو میں اس میں دیکھنا چاہتی تھی۔جس کے خطوں کی پوشیدہ باتیں اس کہانی میں شامل ہیں۔جس میں "Reading between the lines" کی گنجائش اپنے آپ ہی چھوٹتی چلی گئی ہے۔یہ کہانی باں کڑ کہ اس کھیتوں والی لڑکی کو ہی منسوب ہے۔ہاں یہ ضرور کہوں گی خودکشی زندگی سے نبرد آزماں اور ہار مان لینے کا نتیجہ ہے۔ہر شخص کی زندگی میں اندھیرے کے بعد اجالا بھی آتا ہے۔وہ 'باں کڑ' والی لڑکی اگر ہمت نہ ہار جاتی تو کون جانے اپنی بیٹی کی مسکراہٹ اس کو جینے کا نیا حوصلہ دیتی۔وہ اپنی چھوڑی ہوئی پڑھائی پوری کر لیتی اور ایک عزت بخش زندگی اس کے جینے کے نئے دروازے کھولتا۔اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے، تعلیم اور خود کفیل ہونا کسی بھی لڑکی کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا پہچان کرنے کی اتنا طاقت ورتو کر دیتی ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر اپنے لیے ایک راہ استوار کر سکے۔

● ● ●

کہانی

تارابائی چال: کمرہ نمبر 135

اس بانجھ عورت کے اڑتیس سالہ مرد مرے آج چوہ دن گزر گئے تھے۔

نہانے کے بعد نچوڑے ہوئے پیٹی کوٹ سے اپنا گیلا بدن پونچھتے ہوئے اچانک اس کی نگاہ آئینے پر پڑی۔اس نے آئینے کی دھول کو گیلی انگلیوں سے صاف کیا۔وہ حیرت زدہ ہو گئی۔ہفتوں مہینوں، برسوں سے اس نے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔

پچھلی بار اس نے آئینہ کب دیکھا تھا؟ شاید تب، جب شادی سے پہلے پانچویں کلاس میں پڑھتے وقت اسکول جانے سے پہلے بالوں میں ربن باندھتی تھی۔آج اسے محسوس ہوا کہ وہ پہلی بار خود کو آئینے میں دیکھ رہی ہے۔پہلے وہ آئینے میں دیکھ کر چوٹی گوندھتی تھی تو صرف آنکھیں دیکھتی تھی۔جب کانوں میں بندے پہنتی تو اس کی آنکھیں صرف کانوں کو دیکھتی تھی۔سارے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ملا کر اس نے اپنا چہرا ایک ساتھ پہلی بار دیکھا۔

آئینہ مٹ میلا تھا اور چھوٹا۔وہ اپنے پنجوں پر اُچکی۔بہت آہستہ اس نے بدن سے گیلا کپڑا ہٹایا۔گلے سے نیچے اس نے اپنے آپ کو کبھی آئینے میں دیکھا ہی نہیں تھا۔وہ یک لخت دیکھتی رہی، دیکھتی رہی۔گویا کہ پیر سے زمین ریت میں بدل گئی اور پیر نیچے گھسنے لگے۔اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما اور تہہ خانے میں اتر گئی۔وہ نیچے دھستی رہی، دھستی گئی، اتنی کہ ہونٹوں تک ریت گجگجانے لگی، دل اچھل کر ہتھیلیوں میں آ گیا۔اس نے اپنے سر کو سمیٹا اور لمبی سانس لے کر ہتھیلی کو بائیں طرف رکھ کر دھڑکن کو محسوس کیا۔پھر اپنے کو اوپر کھینچا، زمین پر پیروں کو محسوس کیا۔اب اس کی انگلیاں سینے پر پڑے نئے پرانے زخموں کو سہلا رہی تھی۔سینے پر دونوں جانب جگہ جگہ کتھئی کالے

نشان اور سوکھے ہوئے نشان پر بنے گڈھے تھے ۔آخری نشان پندرہ دن پرانا تھا۔جب ہمیشہ کی طرح اس کے مرد نے مباشرت کے بعد عادتاً بیڑی سلگائی تھی اور آخری کش کھینچ کر اس کے بائیں سینے پر جلتی سلائی سا چھو دیا تھا۔وہ درد سے چیخ اٹھی تھی تو وہ تمبا کو بھرے دانتوں سے مسکرا دیا تھا۔جب تک وہ زور لگا کر جھٹکتی ،بیڑی کا سرا چمڑی کو پار کر گیا تھا۔اس نے سسکاری بھرتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ مروڑ دیا تو وہ اور زور سے کھل کھلایا تھا۔بیڑی یا سگریٹ سلگا کر اس کے بدن پر کہیں بھی داغ لگا دینا۔اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ترے بدن میں کوڑ پھوٹے مرتے وقت تجھے کوئی پانی نہ دے۔اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھار شروع ہوگئی ۔پر مرد تب تک کروٹ بدل کر خراٹے بھرنے لگتا۔کمرہ خراٹوں سے بھر جاتا۔اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔اسے مرد کی کھل کھلاہٹ اور خراٹوں میں کوئی فرق نہیں لگتا تھا۔

جب 'بھائی کھلا' کی لوکل ٹرین حادثے میں اس کے مرد کی لاش گھر آئی تو اسے یقین نہیں ہوا۔اس کمرے میں اس کے مرد کا بے جان جسم پڑا تھا۔چھت سے بارش کا پانی رِس رِس کر اس کے جسم پر ٹپک رہا تھا۔کمرے کی کھونٹی پر اس کی بدرنگ قمیض ٹنگی تھی اور خراٹے اب بھی دیواروں سے چپکے بیٹھے تھے۔اس کے سینے پر پچھلی رات کا تازہ گھاؤ پہلے سے زیادہ تکلیف دینے لگا تھا۔اس کے بدن پر پڑے تمام گھاؤ زندہ ہو گئے تھے۔وہ دہاڑے مار مار کر رو رہی تھی۔ پتا نہیں اپنے سینے پر تکلیف زدہ زخموں کی وجہ سے یا اپنے شوہر کی موت کی وجہ سے۔

چھت سے ٹپکتے آنسوؤں اور پانی کے بیچ وہ جسم کب اٹھالیا گیا،اسے پتا نہیں چلا۔اس نے کالے دانوں والا منگل سوتر اتار کر رکھ دیا چار دن بعد اس نے کام پر جانا شروع کر دیا۔

واپس لوٹنے پر اسے کمرہ بہت بڑا لگا۔کھردرے فرش پر گھٹنوں رینگتے ایک جوڑی ننھے پیروں کی خواہش اور کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کا خواب کونوں میں دبک کر،کمرے کو خالی اور ڈراؤنا بنا رہا تھا۔اسی کمرے میں وہ دونوں بھیڑ کی طرح آپس میں ٹکراتے یا ایک دوسرے سے کتراتے رہتے تھے۔اس کے بعد دن بھی اسے بڑے معلوم ہونے لگے۔کام سے لوٹ کر وہ روز فرش کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی۔پر ایک عجب سی گندھ تھی۔جو ٹھہرے ہوئے وقت کی طرح وہاں بیٹھ گئی تھی اور جانے کا نام نہیں لیتی تھی۔جب رات میں کام سے تھکی ،ٹوٹی پست ہو کر کھاٹ پر لیٹی تو

چھت پر لٹکے اور دیواروں پر بیٹھے ہوئے خراٹے نیچے اتر کر اس کے آس پاس پسر جاتے۔ چھت کی پھانک سے مرد کی بے رحم کھل کھلاہٹ برسات کے پانی کی طرح جھرنے لگتی۔ اس کے سینے پر روز ایک نیا زخم کھولتے پانی کی تیز دھار سا پڑتا اور وہ چونک کر اٹھ جاتی۔

اس نے اپنے مرد کی ساری چیزوں کو اٹھا کر آنکھوں سے دور رکھ دیا۔ شراب کی بوتل کو دروازے سے باہر رکھا اور کھونٹی پر ٹنگی قمیض کو کھاٹ کے نیچے کپڑوں میں ڈال دیا۔ کھونٹی پر پرانہ آئینہ لگا دیا۔ جو پہلے کسی کونے میں پڑا تھا اور اس میں وہ صرف اپنے بال یا اچک کر اپنی ناک دیکھ سکتی تھی۔ اب وہ آئینہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے راستے میں آجاتا تھا۔

آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے سینے پر سوکھتے گھاؤ کی پپڑی کو انگلی سے ذرا ذرا سا چھیلا تو اس میں سے خون کی لال بوندیں چھل چھلانے لگیں۔ اس کا بھرم تھا کہ گھاؤ سوکھ رہے ہیں۔ وہ اب بھی گیلے تھے۔ اس نے گیلے پیٹی کوٹ سے آئینہ کو ڈھک دیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

کپڑے پہننے کے بعد اس نے دیکھا، کھڑکی کی اکھڑی ہوئی کالی لکڑی کی درازوں سے چھوٹے چھوٹے تل چٹے چودہ دن سے سوکھے پڑے مرد کے دانت صاف کرنے کے برش پر رینگ رہے تھے۔ اس کے پاس ہی کونے میں سگریٹ کا خالی ڈبہ تھا۔ وہ اسے موڑ کر پھینکنے کو ہوئی کہ دیکھا اس میں آخری ایک سگریٹ بچی ہوئی تھی۔

اس نے سگریٹ سلگائی اور اپنے مرد کے انداز میں ایک کش کھینچا۔ پھر ایک اور، پھر ایک اور، آخر ایک جنون میں اس نے جلتے سرے کو اپنے پیٹ پر دبا دیا۔ پیٹ کی نرم چمڑی پر انگارا پڑتے ہی اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اوپر اٹھ کر کمرے کی چھت تک پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں کی کوروں تک آنسو ڈب ڈبا رہے تھے۔ اس کے رونے کا غبار گلے تک اٹھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہچکیوں سے تھک کر کچھ دیر بعد وہ خاموش ہوگئی۔ بھیگی آنکھوں سے اسنے کھاٹ کی جانب دیکھا۔ وہاں اس کے مرد کا دھندھلا عکس پیر ہلاتے ہوئے بیٹھا تھا اور اس کے چہرے کی بے رحم ہنسی آئینے جیسی صاف تھی۔

• • •

مصیبت زدہ عورت کی تکلیف زدہ خوشی

ظلم وتشدد ایک منفی جذبہ ہے اور ظالم شخص اپنے اندر کی ساری مایوسیوں کو اپنی بیوی یا بچوں ''یعنی ایسے لوگ جو جسمانی طور سے اس سے کمزور ہیں'' پر جارحیت کا مظاہرہ کر اپنے اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے پیچھے اہم وجہ بیوی کا شوہر کی تلخ گوئی پر خاموش رہنا۔اس خاموشی کی وجہ جذباتی بھی ہوتی ہے ۔ایک عورت کی تہذیب شوہر کے ساتھ لیے گئے سات پھیروں سے اس قدر جکڑ لیتے ہیں کہ وہ بہت سی غیر ضروری باتوں کو برداشت کرتے ہوئے چلتی ہے۔مزاحمت وہ تبھی کرتی ہے جب چیزیں برداشت سے باہر ہو جاتی ہیں اور اس کا کمزور ہوتا جسم تشدد کو برداشت نہیں کر پاتا۔کہیں کہیں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ وہ ایسے ظلم کی خوگر ہو جاتی ہے کہ یہ درد اسے زندگی کا حصہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

خواتین کاؤنسلنگ سینٹروں میں عجیب وغریب معاملے سامنے آتے ہیں۔ایک پڑھی لکھی ''گریجوئٹ اور ٹیچر ٹریننگ کا کورس پاس'' لڑکی شادی کے بعد پوری خوش دلی سے اپنے شوہر کے ساتھ رہی ۔ڈیڑھ سال بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹے کے پیدا ہونے کے بعد غیر متوقع طور سے شوہر کا رویہ تبدیل ہو گیا۔اسی شہر میں رشتے کی پھوپھیری بھانجی ہاسٹل میں رہنے آئی عمر میں پندرہ سال چھوٹی۔شوہر اسے ویکنڈ پر گھر لے آتا ہے۔اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے۔ بچے کے ساتھ تینوں کھیلتے ہیں ۔شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بچہ بیمار ہوا تو اسے تین دن اسپتال رکھنا پڑا۔بیوی بچے کے ساتھ تین دن اسپتال میں کیا رہی ،ادھر شوہر کا اس لڑکی کے ساتھ رشتہ بن گیا۔بیوی کے سامنے ہی اسے دوسرے کمرے میں لے جاتا۔اس سے پہلے وہ اپنی بیوی کے سارے کپڑے اتار کر رکھ دیتا۔وہ اپنے چھ مہینے کے بچے کو سنبھالے روتی رہتی۔اپنے والدین سے

شوہر کی اس حرکت کو بتا نہیں سکتی تھی ۔ کیوں کہ چھوٹی بہن کی شادی کی بات چل رہی تھی ۔ اگر وہ اپنے چھ مہینے کے بچے کو میکے لے جاتی ہے تو چھوٹی بہن کی شادی رک سکتی تھی ۔ سب کچھ وہ خاموشی سے برداشت کرتی رہی، لیکن ایک بات وہ سمجھ نہیں پاتی کی اس کے کپڑے کیوں اتار دیئے جاتے ہیں؟ یہ اسے بہت بعد میں سمجھ آیا کہ شوہر کو یہ ڈر تھا کہ وہ پیچھے کے دروازے سے نکل کر پولس کو نہ بلا لائے ۔ بنا کپڑوں کے عورت باہر نہیں جائے گی ۔ اس لیے اس کے کپڑے اتار کر بچے کے پاس چھوڑ دیا جاتا ۔ سیکس کی ہوس مرد کو بے شرم ہی نہیں بلکہ ظالم، اور شیطان بنا دیتی ہے ۔

چھوٹی بہن کی شادی کے بعد اس نے ہمت کر کے ایک دوپہر تھانے میں جا کر پرچہ کرایا اور رات کو خواتین پولس کو گھر میں رکھا ۔ جس نے اس شخص کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا ۔ حیرانی ہمیں تب ہوئی جب وہ تیسرے دن اپنے شوہر کے لیے کھانا بنا کر لے آئی کہ وہ تین دن سے نہ جانے کیسے کھانا کھا رہا ہے ۔ اسے گھر کا کھانا یاد آتا ہوگا ۔ سارے غیر انسانی، غیر اخلاقی اور برے رویہ کے باوجود اس طرح کے جذباتی اُنسیت سے کسی عورت کا نکل پانا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ آخر کار وہ الگ رہی آج وہ نوکری کر کے اپنے بچے کو تعلیم سے آراستہ کر رہی ہے ۔

عورت کو یوں ہی زمین کا مترادف نہیں گردانا جاتا ۔ وہ نہ جانے کتنے اونچے نیچے پہاڑ خندق، گہرے سمندر کی لہروں کے تھپیڑے، اپنے سینے پر جھیلتی چلتی ہے ۔ ممبئی کی ایک تارابائی نما چال میں رہنے والی یہ محنت کش عورت ہمارے پاس مدد کے لیے آئی تھی ۔ اپنے شوہر کو بری بری گالیوں سے کوستی، اس کی ظلم کو بتاتی اپنے کپڑے کو کھول کر اپنے شوہر کی بیڑی سگریٹ سے جلے ہوئے بدن پر پڑے کچھ رِستے کچھ سوکھے گھاؤ دکھاتی اور زار و قطار روتی ۔ معاشی طور سے وہ خود کفیل تھی ۔ چار پانچ گھروں میں صاف صفائی کا کام کرتی ۔ اپنے شرابی مرد کو بھی پال رہی تھی ۔ بچہ بھی کوئی نہیں تھا جو ساتھ رہنے کو مجبور ہوتی ۔ بار بار ہمارے سمجھانے کے بعد بھی جب اس نے اپنے شرابی شوہر کو نہیں چھوڑا تو ہم غصے سے بول اٹھے اگر مشورے پر عمل نہیں کرنا ہے تو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اب اس نے بتانا ہی بند کر دیا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے ۔ شوہر اس کے لیے ایک ایسی عادت بن چکا تھا جس کے بنا گزارا نہیں تھا ۔ شاید اسے تکلیف سے ہی خوشی ملنے لگی تھی ایسی برداشت کرنے والی عورت کی تکلیف زدہ خوشیاں کہاں لے جائے گی ۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کے لیے شوہر کا بُرا سلوک اس کی عادت بن گئی ہے۔ تکلیف بھی افیم سا نشا دیتی ہے۔ ہزاروں عورتیں روز مرہ کے روٹین میں ایسی تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے چلتی ہیں۔ جب ایک عورت خود سے نہ چاہے کوئی بھی ادارہ اسے ظلم وتشدد سے نہیں بچا سکتا۔ راحت حاصل کرنے کے لیے پہلا قدم ظلم برداشت کرنے والی عورت کو خود آگے آنا ہوتا ہے۔

● ● ●

کہانی

تیسری بیٹی کے نام: یہ سرد خشک اور بے جان لفظ

سنینا آج تو ہوتی تو اٹھائیسواں بسنت دیکھتی۔

اس دن تو میرے کمرے کے باہر بسنت تھا اور اندر ایسے چہرے جو بسنت کو پت جھڑ میں بدل رہے تھے۔ ڈرے سہمے چہرے۔ چہرے جن پر منحوسیت چھائی تھی۔ ترس کھاتی آنکھیں، سمٹتے ہوئے جسم، جیسے وہ میری تیسری بیٹی کی پیدائش پر نہیں اس کی ماتم پرشی پر آئے ہوں۔

اور ان مردہ چہروں سے انجان تو میری بغل میں لیٹی تھی۔ روئی کی طرح ملائم، اپنا کھلا ہوا چہرہ لیے تم نے اپنی بند کی ہوئی آنکھیں کھولی تھی اور تو مسکرائی تھی۔ تیری خوبصورت چمکتی نیلی آنکھوں پر میں نے تیرا نام لکھا تھا سنینا۔

تبھی بوڑھی بوا چمکتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ کیسا گورا چٹا سلونا بچہ، ہائے میری نظر نہ لگے۔ بوا نے تجھ پر سے چادر ہٹائی اور منہ بنالیا۔ لمبی سانسیں کھینچ تیری سلوٹوں والی جانگھوں کے بیچ ہلکی سی چپت لگا کر بوا نے اس خالق کو کوسا تھا۔ ہائے میرے ربا۔ اِک حور لڑکی؟ بناڑے والے گھر مٹی تھوڑ رہ گئی سی؟" ایک اور لڑکی؟ تجھے بناتے وقت مٹی کم پڑ گئی تھی؟" میں شرمندہ ہوئی۔ پیدا ہوتے ہی تجھے برہنہ کیا جا رہا تھا۔ میں نے فوراً پوری چادر سے تجھے ڈھک دیا۔ تجھے چادر سے ڈھک کر تیری عزت محفوظ کر رہی تھی میں۔

"بوا ایسا مت بول۔ یہ میری بیٹی بھی ہے اور بیٹا بھی۔ بیٹا ہوتا تو بھی اتنی تکلیف دے کر اتنا ہی خون بہا کر پیدا ہوتا"۔

"بیٹی تو بیٹی ہی رہتی ہے، ہمم، اسے بیٹا بنانے کی جرأت مت کرنا" بوا طنز بھرے انداز میں مسکرا کر چل دی اور میں نے ٹھنڈے سخت چہروں سے آنکھیں ہٹا کر تجھے اپنے سائے کی ٹھنڈی

چھاؤں سے ڈھک دیا تھا۔

اس سائے کے تلے تو ہنسنے لگی۔تو کھلنے لگی۔ترے ننھے ننھے پاؤں زمین پر ڈگ مگ چلے، تھر کے، ترے منہ سے بول پھوٹے۔تو نے پہلا لفظ بولا ماں اور تیری ماں ترے ساتھ چہکی۔تو نے بستہ کندھے پر لادا تو نے توتلے بول میں گانے گائے ۔اور گانوں پر ہاتھ پاؤں ناچتے، آنکھیں مٹکاتے تو سات برس کی ہوگئی۔پھر ایک دن تو اسکول سے واپس آئی ترے چہرے پر دہشت تھی۔''ماں بس کے کنڈکٹر نے مجھے یہاں چھوا تھا اور پھر ہنسا تھا۔مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔''اس چھوٹی سی عمر میں ہی میں نے تجھے لڑکیوں کو دی جانے والی تعلیم کا پہلا سبق پڑھایا۔

اور اس دن کے بعد تو چوکس رہنے لگی ۔ہم عمر لڑکوں سے دور، دور چوکس سی ۔تو نے اپنے میں، ان میں فرق کرنا سیکھا۔تو اور بڑی ہوئی ۔تو کلاس میں اول آئی ۔اسکول کی ریس میں شیلڈ لائی تیرا کمرہ میڈل اور ٹرافیوں سے بھر گیا تو نے اپنی حفاظت کرنا خود سیکھا۔

تو اور بڑی ہوئی ۔تو خوابوں سے کھیلنے لگی۔ تجھے اپنے ساتھ پڑھنے والا ایک لڑکا اچھا لگنے لگا تھا۔تمہارے خواب ایک تھے، خوشیاں ایک پر تمہارے مذہب الگ تھے۔ہم سب نے تجھے گھیرا۔ تجھے کبھی آنسوؤں کا کبھی اپنی ممتا کا واسطہ دیا، مذہب بہت بڑی دیوار ہے وقت رہتے سمجھ جا، تو سمجھدار تھی ۔اپنے اندر کی آگ میں جلتی رہی لیکن تو سمجھ گئی ۔وقت نے ترے گھاؤں پر مرہم کا کام کیا۔تو نے بکھرے بکھرے ہوئے سے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی ۔بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیں۔جو بیٹا نہ کرتا تو نے کر دکھایا۔بلندیوں کو چھونے کے دوران تجھے اپنے خوابوں کا ایک اور راجکمار ملا۔تیری طرح وہ بھی بلندیوں کی، چاند ستاروں کی بات کرتا تھا۔اس کے بھی اونچے خواب تھے۔تیری طرح وہ بھی اچک اچک کر آسمان کو چھو لینا چاہتا تھا۔

اپنی بیٹو سی بٹی کو سلمٰی ستارے والی لال ساڑی میں لپیٹ کر ہم نے گیلی آنکھوں سے تجھے وداع کیا۔تیرے خوابوں کے راجکمار کے ساتھ۔یہ تیری زندگی کا آخری حادثہ تھا۔تیرے گلے میں اپنے نام کا منگل سوتر پہن کر وہ راجکمار، راجکمار نہیں رہا، تیرا شوہر ہو گیا۔

تجھے سیڑھی بنا کر وہ اوپر اور اوپر اٹھتا گیا وہ پھر پیچھے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔تو نے اپنے ہاتھ کیوں بڑھائے اس کی جانب ۔؟ وہ آسمان کی طرف بڑھتے ترے ہاتھوں کو باورچی خانہ کی

بند کھڑکی کی طرف لانا چاہتا تھا، جہاں سے ایک ٹکڑا آسمان بھی تجھے صاف دکھائی نہ دے۔ کیوں نہیں مانی تو نے بات؟ اس نے تجھے تالوں میں بند کر دیا۔ تجھے پھر بھی دہشت نہ ہوئی تو اس تہہ خانے سے نکلنے کے راستے ڈھونڈ ھنے لگی۔ اپنی آواز بند دروازے کے باہر پہنچانے کی جرأت کر بیٹھی۔

سزا تو تجھے ملنی ہی تھی۔ اپنے شوہر سے اونچا اٹھنے کی سزا اپنے شوہر سے بغاوت کرنے کی سزا۔ اپنے خوابوں کو سچ میں بدلنے کے ارمانوں کی سزا۔ اپنی دنیا سے باہر سرنگیں کھودنے کی سزا۔
وہ تجھ پر ظلم ڈھانے لگا باہر کی دنیا سے تیرے سروکاروں کو اس نے رد کر دیا۔ تجھ پر پہرے بٹھا دیے۔ اکیلے کمروں میں تیرا دم گھٹنے لگا تو نے ایک دن اس قید خانے سے نجات حاصل کرنی چاہی اور زہر کو گلے سے نیچے اتار لیا، پر تجھے جینا تھا۔ یہ قسمت تھی یا کچھ اور، پر اس نئی زندگی نے تجھ میں جینے کا، لڑنے کا نیا حوصلہ بھرا، تو نے اپنے پیروں کے نیچے کی زمین کو پہچانا۔ اس پر تجھے چل کر دکھانا ہے اور اپنے حصے کا سامان اپنے مٹھیوں میں بند کرنا ہے، یہ تو نے ٹھان لیا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ تیرے ہاتھ آسمان کی بلندیوں تک پہنچے، اس نے تیرے پنکھوں کو کتر ڈالاستاروں کو چھونے کے لیے تیرے بڑھتے ہاتھوں کو کاٹ کر جھونک دیا بھٹی کی جلتی آگ میں۔ جتنی تیزی سے اس آگ کی لپٹیں پھیلیں تھیں اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈی بھی ہو گئی۔

تیسرے دن اخبار میں سرخیاں "Her ambitions let to her death" تھیں کہ تیرا شوہر ترے پہلے پیار کو برداشت نہیں کر سکا، اس لیے غصے میں اندھا ہو کر اس نے ترے چیتھڑے کر ڈالے اس کے ساتھ ہی ترے لیے ہمدردی کی لہریں خاموش ہو گئیں۔ سب نے کہا تو اپنی موت کی وجہ خود ہی تھی سنینا! کیوں تو نے پنکھ پھیلا کر آسمان کی بلندیوں تک رسائی چاہی تھی؟ گھر کی دہلیز سے دور دور ہو جاتی تھی تو؟ کیوں اتنے متبادل تھے ترے پاس شوہر کی دنیا سے الگ بھی۔؟ تیرا شوہر تو صرف بہانا تھا۔ تو نے خود کو ختم کیا۔ تیری یہ سزا تو صدیوں سے پہلے طے کی جا چکی تھی۔ اسے بدلا کیسے جا سکتا تھا بھلا؟ پھر بھی بار بار کیا گیا تیرا پوسٹ مارٹم۔ تیرے بھورے بالو کا کیا گیا ملان، تیری تصویر سے کیمیکل کے بیچ مہینے بھر محفوظ رکھی گئی لاش تیرے کٹے ہوئے ادھ

جلے اعضا......آج چتا پر چڑھنے جا رہے ہیں اپنے شوہر کے زندہ رہنے کے ساز سنگار سے مزین ہو کر۔

سلمیٰ ستارے والی لال ساڑی کے کفن میں لپٹی سہاگن سی نینا۔کیا رکھوں تیری چتا پر؟ سوائے ان سوکھے بے جان لفظوں کے جو تیرے کسی کام کے نہیں۔لفظ صرف لفظ اس ملک کا قانون نہیں بدل سکتے نہ وہ بن سکتے ہیں پھانسی کا پھندا جو تیرے قاتلوں کے گلے میں ڈالا جا سکے۔

سفید کاغذ پر لکھے یہ کالے حرف رکھتی ہوں تیری چتا پر! یہ سوکھے پتوں کی طرح تیری چتا کی آگ کو ہوا دیں گے اور بجھ جائیں گے ان چنگاریوں کی طرح جو راکھ سے اٹھتی ہیں۔تیرے ساتھ ہی مدغم ہو جائیں گے یہ حرف یہ لفظ! ہوا سے ہوا، آگ سے آگ، پانی سے پانی، آسمان سے آسمان، مٹی سے مٹی! سب دھواں ہو جائے گا۔بس رہ جائے گی ایک مٹھی راکھ!۔

لیکن میری بچی۔اپنی کٹی ہوئی ہتھیلیاں نہ پھیلانا اس بنانے والے کے سامنے کہ پچھلی بار تجھے بناتے وقت جو بھول کی تھی، اسے صحیح کر لے! نہیں! تجھے تو پھر پھر وہی بننا ہے! پھر پھر عورت! سو جنموں تک عورت! تب تک ایک عورت، جب تک تیرے حصے کا آسمان، تیرے اور صرف تیرے نام نہ کر دیے جائیں۔

• • •

ایک ماں کی دعا: تجھے پھر سے بننا ہے عورت

تیسری بیٹی کے نام: یہ بے جان لفظ دراصل کہانی کی طرح لکھی ہی نہیں گئی۔ کہانی ''انا پورنا بورڈ کا آخری خط'' اور اُرمیلا خاندان کی کہانی ''انصاف'' سے ہم نے ممبئی کے 'وکولا' واقع ویمینس سینٹر میں غیر تعلیم یافتہ خواتین کے بیچ کہانی پڑھنے کی ایک ورکشاپ شروع کی تھی۔ یہ کہانی ایک لمبی نظم کے فارم میں سامعین کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن ممبئی کی ایک مشہور چھوٹی میگزین ''کتھا بِمب'' 'میری سوانح کے ساتھ مدیر کو غیر شائع شدہ کہانی چاہیے تھی۔ اس لیے میں نے اسے نظم سے الگ کر کہانی کی شکل میں شائع کروا دیا۔

اس کہانی کے ذریعے میں خواتین کو نینا سہانی کے تندور سانحہ اور انڈیا موسٹ وانٹیڈ کی انجو سنگھ کی خودکشی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ کیوں کہ اخباروں اور نیوز چینلوں پر الگ ہی تصویر پیش کی جا رہی تھی۔ لڑکی کے کردار کو کٹ گھرے میں کھڑا کر اس پر الزام لگانا سب سے آسان کام ہے۔ میڈیا اس میں پوری مدد کرتا ہے۔ کیوں کہ میڈیا کو سنسنی خیز بکاؤ خبریں چاہیے لڑکی کے ریپ سے زیادہ بکاؤ بھلا کیا ہوگا؟۔ 2008 میں آروشی قتل کیس میں تیرہ چودہ سال کی اسکولی لڑکی کو بھی بخشا نہیں گیا۔

کئی بار سماج میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو آپ کی ذاتی زندگی سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود بھی آپ کو اندر سے دہلا دیتے ہیں۔ اخباروں میں اکثر ایسے واقعات آپ کے نظروں کے سامنے سے گزرتے ہیں جنھیں پڑھ کر آپ الجھ جاتے ہیں لیکن وہ آپ کی پہنچ سے دور ہوتے ہیں اس لیے آپ کے پاس ناراضگی کو نگلنے کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں ہوتا۔ یہ دیکھنا بھی غم سے پُر ہوتا ہے کہ ایسے واقعات اخبار کے پہلے صفحات سے ہٹ کر کیسے آہستہ آہستہ اندر کے

صفحات میں سرک جاتے ہیں۔اس کا پھیلاؤ بھی سمٹتا جاتا ہےاور پھر وہ خبر باسی ہوکر ہمارے ذہن میں اتر جاتی ہے۔ڈیڑھ عشرہ پہلے ایک سیاسی پارٹی کے نوجوان نیتا سوشیل شرما نے اپنی بیوی نینا سہانی کا قتل کر اس کی لاش کو اپنے قریبی دوست کے ہوٹل کے تندور میں جھونک کر سارے ثبوت مٹانے کی کوشش کی تھی،لیکن وہ پکڑا گیا۔ان دنوں یہ تندور کانڈ سرخیوں میں تھا۔اس وقت میں نے ڈائری میں لکھ کر اپنی ناراضگی کو ایک آؤٹ لیٹ دینے کی کوشش کی تھی۔

کچھ سال بعد ایسا ہی ایک اور واقعہ رونما ہوا اپنے شوہر کے سامنے انجو سنگھ ''الیاسی'' نے اپنے پیٹ میں چاکو گھونپ کر خودکشی کر لی تھی۔دونوں واقعات میں کچھ مماثلت تھی۔دونوں عورتیں خوبصورت ،ذہین اور کیریسٹ تھی۔دونوں کے شوہروں نے ان ذکی الفہمی کو سیڑھی کی طرح استعمال کیا۔''انڈیا موسٹ وان ٹیڈ' کا خاکہ انجو کا تھا۔انجو اور صہیب دونوں نے مل کر اسے شکل دی تھی۔''انڈیا موسٹ وان ٹیڈ'' پروگرام کا خاکہ جب منظوری کے لیے جمع کیا گیا تو اس میں ڈائریکشن انجو سنگھ کا تھا۔لیکن جب پروگرام شروع ہوا تو صہیب چھائے تھے۔پروگرام کی ٹی۔آر۔پی۔ریٹنگ بڑھنے اور اینکر کے بلندیوں تک پہنچنے کے بیچ کس طرح انجو کے پردے کے پیچھے دھکیلی جاتی رہی۔اور گمنامی کے اس اندھرے میں گم ہوجانے سے اسے کتنی گھٹن محسوس ہوتی ہوگی۔یہ کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ یہ خودکشی کا معاملہ تھا۔اور خودکشی کا سبب بننے کی ذمہ داری قانوناً کسی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔سیلیبرٹی پر تو کبھی نہیں۔بیوی کے کیس سے رہا ہونے بعد صہیب باہر کھڑی عوام سے ایک رسوخ دار پولیٹشین کی طرح ہاتھ ہلا رہے تھے۔جسے دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔اس کے چہرے پر نہ تو شرمندگی تھی نہ ہی جرائم کے نشان۔اگر کچھ تھا تو کامیاب ہونے کا غرور۔صہیب الیاسی کو آخر کار ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

انجو کی ماں اور بہن اس لڑائی میں تھوڑی دور تک ہی شامل ہوئے۔پھر تھک کر بیٹھ گئی۔یہ سوچ کر کہ ان کی لڑائی مری ہوئی انجو کو تو واپس لا نہیں پائے گی۔اس طرح کے بہت سے واقعات تاریخ میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔نہ کوئی سوال کیا جاتا ہے نہ کوئی اعتراض درج ہوتا ہے۔نینا سہانی سانحے میں انجو صہیب الیاسی سانحہ جڑ گیا۔اور میں نے اسے پھر سے لکھا۔

آج کے وقت میں جب لڑکیاں بھی اپنی تعلیم اپنے کیریئر کو اہمیت دینے لگیں ہیں۔

جاگیردارنہ تہذیب والے ان کے شوہران صلاحیتوں کو کچل کر کس طرح پیچھے کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں، اسے ایک لڑکی اور پیدا کرنے والی ماں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟۔ یہ ایک ایسا درد ہے جسے ایک ماں سے زیادہ کوئی محسوس نہیں کرسکتا پر اپنی تیسری بیٹی کی چتا کو آگ دیتے ہوئے بھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوتا اور وہ یہی سوچتی ہے کہ تجھے تو پھر پھر بننا ہے عورت……

• • •

کہانی

قتلِ اکبر، قتلِ اصغر

ماں کی کوکھ سے باہر آتے ہی جیسے ہی نومولود بچے کی رونے کی آواز آئی ساس نے دائی کا منہ دیکھا اور ایک طرف سر ہلایا، جیسے پوچھتی ہو کیا ہوا؟ خبر اچھی یا بری۔

دائی نے سر جھکالیا۔ ''چھوری''

اب دائی نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے آنکھ کے اشارے سے پوچھا، کیا کروں؟

ساس نے چلم سر کائی اور بند مٹھی کے انگوٹھے کو نیچے جھٹکے سے پھینک کر مٹھی کھول کر ہتھیلی سے اشارہ دیا۔ ''دبا دے''

دائی پھر کھڑی رہی۔ ہلی نہیں۔

ساس نے دبی، لیکن تیکھی آواز سے کہا سڑیو کونی؟

دائی نے مایوسی دکھائی۔ ''بھور سے دو کو صاف کر آئی، یہ تجی ہے، پاپ لاگ سی''۔

ساس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ ''جیسا بولا کر بیس برس پال پوس کے آدھا گھر باندھ دیو ینگے، پھر بھی سارے دانڑ دیج سے نونکس نکالیں گے اور آدھا ٹن مٹی کا تیل ڈال کے پھونک آئیں گے۔ اس موٹھے جنجال سے یہ چھوٹا گناہ بھلو''۔

دائی بے من سے اندر چل دی کچھ لمحے بعد بچے کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔

باہر نکل کر دائی جاتے جاتے بولی بنڑی سے بول آئی (ماں سے بول آئی) مری چھوڑی جڑمی (مری لڑکی پیدا ہوئی تھی) بنڑی نے سڑیوں تو گہری موٹھی تھکی سانس لے کر چدر تانڑ لی (ماں نے سن کر گہری سانس لے کر چدر تان لی) ساس کی ہاتھ سے دائی نے نوٹ لے کر مٹھی میں دابے اور ٹیٹ میں کھوستے نوٹوں کا ہلکا وزن ناپتے ساس نے ماتھے کی تیوریاں سیدھی کر

کہا۔ ''تیرے بھاگ میں آدھے دن میں تین چھوریوں کو تارنے کا جوگ لکھا تھا تو اس میں میرا کیا قصور؟ ساس نے انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا ''سیرجن ہارڑے پوچھ'' چھوڑے گڑھے کا سانچا رکھ کے کہیں بھول گیا کیا؟ اور پاندان کھول کر منھ میں پان گیلوری گال کے ایک کونے میں دبالی۔

• • •

رحمِ مادر میں بیٹیوں کے قتل کی وجوہات کہاں پوشیدہ ہیں؟

''آپ کے کتنے بچے ہیں''؟ ریل گاڑی سے سفر کرتے وقت ایک عورت نے مجھ سے پوچھا:

''میری دو بیٹیاں ہیں''۔ میں نے فخر سے جواب دیا۔

''بچے کتنے ہیں''۔؟ عورت نے سوال کو سپاٹ لہجے میں دہرا دیا۔

مجھے لگا وہ کان سے تھوڑا اونچا سنتی ہے۔

مسکرا کر میں نے اونچی آواز میں کہا۔''دو بیٹیاں ہیں میری''

''اور بچہ کوئی نہیں''؟

میں منھ کھولے دیکھتی رہی۔

''اور ٹا بر و کونی''؟ (لڑکا) اس نے ترس کھاتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ بچے سے اس کا مطلب بیٹے سے تھا۔ اس کے بعد ایسی ہی باتیں علاحدہ، علاحدہ مقامات پر دہرائی گئیں۔

ممبئی میں ایک کنڑ بولنے والی عورت میرے گھر پر کام کرنے کے لیے آئی۔

معلومات کے لیے میں نے اس سے پوچھا''تمہارے کتنے بچے ہیں''؟

بولی''بچہ نہیں ہے''

اس کی سندور سے لبالب بھری مانگ اور اس کی تقریباً چالیس سالہ عمر کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھنا چاہا شادی کے کتنے سال ہوگئے میری بات پوری ہونے سے پہلے بولی''تین لڑکی ہے میرے کو، بچہ کوئی نہیں''۔

میں نے فوراً کہا ''لڑکیاں کیا بچہ نہیں ہیں، ایسے نہیں کہنا چاہیے''۔

اس نے کہا ''بچہ مطلب لڑکا ہی ہوتا ہے، لڑکی نہیں'' اس نے مزید وضاحت کی ''تین لڑکی پیدا ہوا تو آدمی بہت غصہ کیا میرے کو'' بولا ''لڑکی میں کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے شادی پر، دو کا شادی بنایا، بڑا بیٹی کو ایک لڑکا، ایک لڑکی، چھوٹا کو ایک لڑکا، دونوں کو بچہ ہے، ایک چھوٹا لڑکی کا شادی کرنا باقی ہے''۔

بیٹیوں سے خاندان نہیں بڑھتا بیٹیاں پرایا دھن ہیں، بیٹیوں کو دان دہیز دینا پڑتا ہے، بیٹیاں گلے میں پڑا پتھر ہیں، اس لیے راجستھان، اتر پردیش، مدھیہ پردیش سے لے کر کرناٹک اور آندھر پردیش کے کئی قصبوں میں بیٹیوں کا ہونا بچے ہونے میں شمار نہیں ہوتا۔

بیٹے اور بیٹی کو ہندوستانی معاشرہ نفع ونقصان کے پیرائے میں دیکھتا ہی ہے۔متوسط گھرانہ بھی اپنی اولاد میں لڑکے کا شمار کیے بغیر گھر خاندان کو پورا نہیں تسلیم کرتا۔اس لیے ایک گھر میں چار یا پانچ بیٹوں کا ہونا تو قابل فخر ہوتا ہے۔لیکن ایک کے بعد دوسری بیٹی کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔

آج حالات یہ ہیں کہ بیٹیوں کو پیدا ہونے ہی نہیں دیا جاتا۔کئی گاؤں میں یہ شان سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے گاؤں میں برات آتی نہیں، جاتی ہے۔وہاں بیٹی پیدا ہوتے ہی کہیں اس کے منھ میں نمک ٹھونس کر تو کہیں گلا دبا کر کہیں کیڑے مکوڑے والی دوا پلا کر، کہیں ٹب میں بھرے پانی میں ڈبو کر، کہیں گلے میں مٹکا باندھ کر ندی میں بہا کر، تو کہیں ٹھنڈ کے دنوں میں باہر کھلے میں چھوڑ کر، کہیں کوڑے دان میں پھینک کر، تو کہیں پستان میں زہر لگا دودھ پلا کر انھیں پیدا ہوتے ہی موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں صدیوں سے ''دودھو نہاؤ پوتو پھلو'' یا ''پتر وتی بھوا'' جیسی دعائیں اور بیٹے کی پیدائش، اور ان کی صحت مند زندگی کے لیے کی گئی رسموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گھر کی خوشحالی کے لیے لڑکوں کی اہمیت زیادہ ہے۔اسی دہائی میں اسنوگرافی کا استعمال حاملہ عورتوں کے لیے شروع کیا گیا۔تو اس کا مقصد رحم مادر میں پل رہے بچے کی صحیح نشو ونما دیکھنا تھا تاکہ بچے کی تولد کے دوران عورت کی صحیح طریقے سے خیال رکھا جا سکے۔اور یہ طریقہ کار رحم مادر میں جنسی شناخت کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔مہاراشٹر حکومت نے 1987 میں رحم مادر میں

بچیوں کے قتل پر روک لگانے کے لیے قانون نافذ کیا تھا، جب غازی آباد اور لدھیانہ کے ڈاکٹروں کے گھروں کے سامنے کنویں میں سے سیکڑوں ''فیمل فیوٹس'' نکالے گئے تھے۔

اس کی وجہ سماج میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برعکس چھوٹا کر کے دیکھا جانا ہے۔ایک عام متوسط گھرانے میں شادی کے وقت لڑکی کو دیا جانے والا جہیز درمیانے جمع پونجی والے باپ کے گلے کی پھانس بن کر رہ جاتا ہے۔خوشحال والدین کی دولت میں بھی بھائی اپنی بہن کو خاندانی وراثت میں حصہ دینا نہیں چاہتے۔جہیز کے سبب نہ جانے کتنی لڑکیوں کو جلا کر مار دیا جاتا ہے۔لڑکی کے سسرال میں اس سے جس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔اس کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے گھرانے بیٹی پیدا ہی نہیں کرنا چاہتے۔

آج حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔لڑکیوں کو اگر پڑھنے کا صحیح موقع اور خوش گوار ماحول دیا جائے تو وہ لڑکوں سے کہیں زیادہ ذہین اور ذمہ دار ثابت ہوتی ہیں۔جو رحم مادر میں لڑکی دیکھ کر دختر کشی کروا لیتے ہیں اور انھیں دنیا میں آنے ہی نہیں دیتے۔یہ سوچ کر کہ بڑے قتل سے بچانے کے لیے کیا گیا چھوٹا قتل ہے۔انھیں نہیں معلوم کہ وہ کیا کھو رہے ہیں، کہ بیٹیاں کتنی بڑی نعمت ہیں۔ذہین اور نایاب بیٹیاں صرف خوش قسمت ماں باپ کو نصیب ہوتی ہیں۔کیا بیٹوں اور بیٹیوں کے سرپرست یہ نہیں جانتے کہ بیٹیاں اپنے ماں باپ سے کتنی گہری انسیت رکھتی ہیں۔ان کی کسی بھی تکلیف میں کیسے آگے بڑھ کر ان کا سہارا بنتی ہیں۔بڑھاپے میں لاٹھی بننے والی زیادہ تر بیٹیاں ہوتی ہیں، بیٹوں کے مقابلے کسی بھی طرح بیٹیاں کم ذمہ دار نہیں ہوتیں۔

• • •

باب دوم :

ذہنی تشدد کے خلاف

اگر اہم وجوہات کی تہہ تک جائیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر یقینی اور عدم توازن ہمارے معاشرتی نظام کی وجہ سے ہے۔ معاشرے میں رائج قدامت پسندی کی وجہ سے مرد اپنی بالا دستی کو مقدم مانتا ہے۔ کیوں کہ بچپن سے ہی جسمانی ساخت کا غرور اس کی رگ و پے میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ چاہ کر بھی دقیانوسی خیال سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا۔ مرد اپنی حاکمیت سے باہر نکل ہی نہیں پاتا اور آخر کار اپنے خاندان کے لیے ایسا خوفناک ماحول کھڑا کر دیتا ہے جو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔

• • •

جس کے نشانات ظاہر نہیں ہوتے......

عمر باسٹھ سال۔ایک عام گھریلو عورت۔نام ''ترشا'' ویسے نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔
فرق اس بات سے ضرور پڑتا ہے کہ میں موسیقی کی ماہر ہوں۔شادی سے پہلے اپنے شہر کے ایک مشہور کالج کی مدرس تھی۔لیکن شادی کے بعد چار سال میں دو بچے ہوئے اور بچوں کو آیا کے سپرد نہ کر کے ان کی پرورش کے لیے میں نے نوکری چھوڑ دی۔شوہر بھی یہی چاہتے تھے۔میں اسٹیج سنگر سے باتھ روم سنگر رہ گئی۔

میرے شوہر بغیر کسی وجہ، بنا کسی مدد کے ہر وقت مجھ پر گرجتے برستے رہتے۔کئی بار میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ایک دن جب میں ان کے دفتر جانے کے بعد ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی، میرے بیٹے نے کہا ''ماں آپ کیوں رو رہی ہیں'' پاپا آپ کو مارتے تو نہیں ہیں نا''۔میں حیرت زدہ رہ گئی۔آٹھ سال کا بچہ اپنے پاپا کے چیخنے کو جائز ٹھہرا رہا تھا۔صرف اس لیے کہ وہ ہاتھ نہیں اٹھاتے۔بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے سب سے گہرے دوست کے والد ہمیشہ اپنی اہلیہ کو مارتے رہتے ہیں۔اس لیے اس کے پاپا اگر صرف غصہ کرتے ہیں، اور اس کے دوست کے والد کی طرح ہاتھ نہیں اٹھاتے تو کوئی بات نہیں۔

مجھے ہائی بی۔پی، تھائرائڈ اور پیٹ میں السر رہنے لگا۔مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اندر آہستہ آہستہ کچھ مر رہا ہے۔45 سال میں مجھے گانے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔میں نے ریاض کرنا شروع کر دیا۔ایک دن غصے میں آکر میرے شوہر نے میرا تان پورا توڑ دیا اور چیخ کر بولے یہ کیا کھٹ راگ گا رہی ہو۔میرے جن راگوں پر فریفتہ ہو کر انھوں نے مجھ سے شادی کی تھی، وہ انھیں اب برے لگ رہے ہیں۔

اب پچھلے سال سے میں اکیلی ہوں، خوش ہوں اور اپنی موسیقی کے ساتھ ہوں۔ جسے میں نے گھر سنوارنے اور بچوں کو بڑا کرنے کے سفر میں کھو دیا تھا۔ میرے دونوں بیٹے مجھے اپنی شناخت قائم کرنے میں پوری طرح مدد کر رہے ہیں۔ میں گھر پر لڑکیوں کو موسیقی کا علم سکھا رہی ہوں۔ کاش میں نے پہلے ہی اپنے وجود کو پہچان لیا ہوتا۔ ''دیر آید درست آید''۔

مڈل کلاس کی گھریلو عورتوں کے لیے منعقد ایک ورکشاپ میں، میں نے 1995 میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ جس کا عنوان تھا'' جارحیت کے خلاف ایک عام عورت کی آواز''۔ مقالہ ختم ہونے پر اس پر سوال وجواب کا آغاز ہوا تو ایک عورت نے کہا کہ آپ اپنے مقالے کا وہ پیرا گراف پھر سے پڑھیے جس میں ''سلو پوئزن'' کی بات کی گئی ہے۔ وہ پیراگراف یہ تھا۔

''ظلم کا ایک طریقہ کار سلو پوئزن ہے جسے ذہنی تشدد کہا جا سکتا ہے۔ ایک شوہر کچھ سال ساتھ رہنے کے بعد یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کس طرح کی عورت ہے۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بیوی کو سزا دینے کا سب سے بہترین طریقہ کیا ہے۔ اسے کس طرح کے آلات استعمال کرنے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بیوی پر جسمانی تشدد کر کے یا اسے طمانچہ مار کر اتنی تکلیف نہیں پہنچا سکتا جتنا کہ اسے نظر انداز کر کے پہنچا سکتا ہے۔ اس کو برابر نظر انداز کر، وہ مہذب طریقے سے خود کو علاحدہ کر لیتا ہے۔ وہ اپنے ہی گھر میں اس طرح رہتا ہے جیسے اس گھر میں بچے ہیں، بزرگ ہیں، نوکر ہیں اور مہمان ہیں۔ اگر نہیں ہے تو صرف اس کی بیوی۔ وہ بیوی کو نظر انداز کر کے سلو پوئزن کے ذریعے اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔ فراموشی کے اس عمل سے جو سلو ڈیتھ کی حالت رونما ہوتی ہے۔ اس سے وہ پوری طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن باہر سے دیکھنے پر یہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور اسے وہی عورتیں بہ خوبی سمجھ سکتی ہیں جنھوں نے اس آہستہ موت کو گزرتے ہوئے محسوس کیا ہو۔

خواتین تنظیموں کے دفاتر میں رونما ہونے والے جنسی تشدد کی بات ہوتی ہیں۔ خانگی تشدد میں جسمانی، معاشی، زبانی اور میریٹل ریپ غرض کہ مختلف قسم کے تشدد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کاؤنسلنگ سینٹرس میں ذہنی تشدد کو شمار نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی شناخت دیگر مظالم کی طرح نہیں کی جاسکتی۔ پندرہ سالوں کی کاؤنسلنگ کے دوران ہماری تنظیموں میں ذہنی تشدد کا ایک بھی معاملہ درج نہیں ہوا۔ جب کہ ایک عورت کے لیے زیادہ تکلیف زدہ حالت ذہنی تشدد ہے۔ جس کا

ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ جسم پر لال نیلے نشان یا ہونٹوں پر یا آنکھوں کے نیچے کٹا ہوا زخم کسی مرہم یا دوا سے آخر کار ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن سخت جملے اور طنز کے ذریعے اور برابر نظر انداز کر کے جو زخم یا چوٹ پہنچائی جاتی ہے وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ وہ جسم کے زخم سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔ اس اوجھل چوٹ کو بھرنے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔

اپنے ساتھی کی برابر خاموشی بھی ایک طرح کا ظلم ہی ہے۔ اور جب کہ جسم پر اس کے نشان دکھائی بھی نہیں دیتے اس لیے یہ اندر ہی اندر غیر مرئی بیماریوں سے بھر دیتی ہے۔ شوہر کی برابر خاموشی اور چیخ پکار ہمیں شکایت کرنے کی اہم وجہ محسوس نہیں ہوتی۔ ایسی غیر مرئی تکالیف ہمارے لیے کوئی اہم مدعا نہیں بنتے۔ کیوں کہ ذہنی تشدد کی شکار عورت جب خود ہی مرتے دم تک اس کی شناخت نہیں کر پاتی تو دوسرا شخص اس کی شناخت کیسے کر سکتا ہے۔

جہاں جسمانی تشدد نچلے اور نچلے متوسط طبقے کی عورتوں کا مسئلہ ہے وہیں ذہنی تشدد اعلی طبقے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ نچلا اور نچلے طبقے کا مرد اتنا شاطر اور سمجھ دار نہیں ہوتا۔ وہ غصہ میں کچھ بھی نہیں سوچتا فوراً ہاتھ اٹھا کر تشدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ظلم کے نشان جسم پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں اس لیے فیصلہ لینا آسان ہو جاتا ہے۔

سماجی، نفسیاتی، اور معاشرتی وجوہات:

یہ نا معلوم سلوموشن کا ظلم عام طور پر معاشی اعتبار سے بھرے پورے شخص یا معاشرے میں مشہور و معروف لوگوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں شروع سے بیٹوں کو بیٹیوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وراثت میں ملی ایسی تہذیب اور بربریت بھری سوچ کو لے کر جب وہ عملی میدان میں داخل ہوتا ہے اور کئی مرتبہ اسے اپنے من مطابق رتبہ نہیں ملتا۔ وہ جس طرح سے خود کو اعلیٰ منصب پر دیکھنا چاہتا ہے عملی زندگی میں اسے حاصل نہیں ہونے کی وجہ سے وہ گھر کے لوگوں پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسرا پہلو بھی ممکن ہے۔ جب وہ سماج میں ایک اعلیٰ عہدہ حاصل کر لیتا ہے اور اپنے حاکموں کی جی حضوری کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو گھر واپس آنے کے بعد بھی کرسی کا غرور برقرار رہتا ہے، اور اپنی بیوی سے بھی اپنے نیچے کام کرنے والوں کی طرح لعن طعن

کرتا ہے۔ چوں کہ وہ گھر کے لیے پیسہ لاتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سب اس کے غلام ہیں اور اس کی غیر تعلیم یافتہ بیوی عزت واحترام کے قابل نہیں۔ اسے اپنا اخلاق سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اپنے عہدے اور منصب کی وجہ سے ہمیشہ اپنی بیوی پر طنز کرنا اور نظر انداز کر کے اپنی شخصیت کو پروقار سمجھتا ہے۔

متبادل ہر جگہ ہو سکتے ہیں لیکن انجینئر یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے اشرافیہ گھرانے سے تعلق رکھنے والے لڑکے کسی مہذب گھرانے کی خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ساری مشقت اس کو حاصل کرنے تک محدود رہتی ہے۔ ایک بار اگر وہ لڑکی ''گھر کی مرغی'' ہوگئی تو اس کی قیمت دال برابر بھی نہیں رہ جاتی۔ اور اس لڑکی کا شوہر اس کی ساری خوبیوں اور ہنر کو بالائے طاق رکھ کر صرف اس کی حد باورچی خانے تک کرنا چاہتا ہے۔ ایک بار اگر اس لڑکی نے خود کو فراموش کر دیا تو اعلا منصب پر فائز اس کا شوہر ہمیشہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شادی کر کے بیوی پر احسان کیا۔ اس کے بعد اس عورت سے برائے نام رشتہ رہتا ہے اور سلو پوئزن کے ذریعے موت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں سیکڑوں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لڑکی کی فنکارانہ صلاحیت سے متاثر ہو کر شادی کی گئی لیکن اس کے بعد اس کے فن سے پرہیز کیا جانے لگا۔ مشہور ڈانسر سونل مان سنگھ، دمینتی جوشی جیسی کئی فنکار خواتین ہیں جو اپنے فن کی وجہ سے شادی کے رشتے سے باہر نکل آئیں۔ اور بیشتر ایسی ہیں جنھوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو گھر، شوہر اور بچوں کے لیے قربان کر دیا۔ انھوں نے اپنے شوہر اور بچوں کی ترقی کو سب سے اہم سمجھ لیا اور اپنی ماضی کی ساری صلاحیتوں کی طرف جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ خانگی مسائل کے فرض کردہ اصولوں کو بخوبی ادا کرنے میں پوری زندگی یوں ہی گزار دیتی ہیں۔

عام طور پر اس طرح کی ازدواجی زندگی خوش وخرم دکھائی دیتی ہے۔ نہ صرف ہندوستان بل کہ غیر ملکی عورتیں بھی اپنی رائج تہذیب کے دائرے میں رہنے کی خوگر ہو جاتی ہیں۔ ایک عورت ناسازگار حالات کی اس طرح خوگر ہو جاتی ہے کہ اکثر و بیشتر اسے نوکروں کے سامنے ذلیل کر کے اس کی انا کو مجروح کیا جاتا ہے۔ لیکن نہ تو وہ اس برے ماحول کے خلاف کھڑی ہوتی ہے اور نہ ہی اس طرح کے ظلم کی شناخت کر پاتی ہے۔

مرد کے کام کاج کا بڑا دائرہ اور عورت کا مطبخ

تال میل بنا کر رکھنا ہی ایک اہم آپشن ہے۔اس لیے وہ اپنی اس انجانی تکلیف کا سامنا کرنے سے کتراتی ہے۔اسے باہر آنے سے روکتی ہے چوں کہ پڑھی لکھی اور سمجھدار ہے اس لیے وہ خود اپنے احساس کو دفن کرتی رہتی ہے۔اور اگر مشکلات کا کوئی حل نہ نکلے تو شوہر کے سامنے ''جو حکم میرے آقا والا رویہ اپنا لیتی ہے'' کیوں کہ اسے ہر بار لگتا ہے کہ شوہر صحیح ہے اور وہ غلط۔شوہر کی بڑی ذمہ داریوں کا احساس اسے اس قدر گھر کر لیتا ہے کہ وہ خود کو چھوٹے سے باورچی خانے تک ہی محدود رکھنے میں عافیت سمجھتی ہے۔جب عورت خود ہی مذکورہ گھیرابندی کو نہیں سمجھ پاتی تو وہ اپنی تکلیف کس کے سامنے بیان کرے گی۔

ایسے شوہر کے ساتھ ایک طویل وقت گزارنے کے بعد نہ صرف وہ نظر انداز ہونے کی خوگر ہو جاتی ہے ساتھ ہی اس کی خود اعتمادی بھی برباد ہو جاتی ہے۔اور وہ تسلیم کرنے لگتی ہے کہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے جو اس کے شوہر کو غصہ دلاتی ہے۔اپنی احساس کمتری کی وجہ سے بیوی اپنے شوہر کے ناجائز تعلقات کو بھی برداشت کر لیتی ہے۔یہاں تک کہ وہ اس کا شوہر جب اس کے پاس واپس آتا ہے تو اپنی بازو پھیلا کر سمیٹ لیتی ہے۔گاؤں گھر کی غیر تعلیم یافتہ عورتوں سے لے کر تعلیم یافتہ،نوکری پیشہ عورتوں میں ''صبح کے بھولے بھٹکے'' شوہر کو ''شام ڈھلے گھر لوٹ آنے'' پر قبول کیے جانے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

کبھی کوئی عورت شوہر کے تلخ مزاج یا جارحانہ طرز عمل پر مزاحمت کرتی ہے تو عورت کو پریشان دیکھ کر خاندان کے لوگ بھی سمجھ نہیں پاتے اور یہی کہتے ہیں آخر اس نے ایسا کیوں کیا ہی اور رائی کو پہاڑ بنایا جا رہا ہے۔شوہر مار پیٹ نہیں کرتا اس لیے سب کی نگاہ میں سنجیدہ،تہذیب یافتہ شخص سمجھا جاتا ہے۔اسے خود اپنے میں کوئی خامی دکھائی نہیں دیتی۔

جسمانی تشدد اور ذہنی تشدد میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ شراب کے نشے میں یا شراب کے نشے کے بہانے سے جب ایک شوہر اپنی بیوی کو رات کی تاریکی میں زدوکوب کرتا ہے۔دوسری صبح نشہ اترنے کے بعد یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ بیوی کے جسم پر دیے گئے لال نشان کے

لیے پاؤں پکڑ کر معافی مانگنی ہے یا جوتے پہن کر پھر سے آنکھ دکھاتے ہوئے کام پر باہر جانا ہے۔

ذہنی تشدد میں حالات بالکل برعکس ہوتے ہیں کیوں کہ شوہر بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اور اس کے جسم پر چوٹ کے کوئی نشان نہیں چھوڑتا۔ اس لیے انھیں کوئی احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ زندگی بھر اسے محسوس نہیں کر پاتا کہ وہ کچھ غلط کر رہا ہے۔ ایسے شوہروں کی لغت میں معافی تلافی کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ پڑھے لکھے روشن خیال لوگوں کا یہی رویہ ہے۔ بیوی کو ہاتھ مارنا برا بھلا کہنا ظلم میں شمار کیا جائے گا اس لیے ایک مہذب شوہر برے القاب بھی نہیں استعمال کرتا۔ وہ ان سے بہتر سلو پوئزن کا استعمال کرتا ہے جس میں نظر انداز کرنے اور خاموش رہنے کا میٹھا زہر شامل رہتا ہے۔

ایسے مرد دوہری شبیہ رکھتے ہیں۔ ایک وہ جوان کی نمائشی شبیہ ہے جس میں وہ بے حد خوش مزاج، زندہ دل، ہمیشہ مسکرانے والے شخص کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کا شوہر آپ سے بات نہیں کرتا جب دوسرے لوگ جو آپ کے قریبی ہیں وہ اس کے مزاج کے خوب قصیدے پڑھتے ہیں۔ اس کا جو چہرہ گھر کی چہار دیواری کے اندر ہے وہ اس باہری شہر سے کافی الگ ہے۔ اس لیے بیوی ہمیشہ تذبذب میں رہتی ہے کیوں کہ وہ ایک شخص کی دوشبیہ سے جوجھ رہی ہوتی ہے۔ کسی تقریب یا قریبی رشتہ داروں کے یہاں جاتے ہی وہ زندہ دل انسان کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ خود بھی مسکراتی ہے۔

دوسری شبیہ گھر کے اندر اپنے کمرے یا پڑھنے کی میز پر جھکا ہوا ایک خاموش طبیعت شخص جو اپنے ہی آپ میں گم دنیا و مافیہا سے بے خبر جس میں کوئی نرمی نہیں۔ گھر کے افراد سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے رویہ سے گھر کے سارے افراد دہشت میں رہتے ہیں۔ وہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں سنجیدہ اور پروقار شخص جس کی اچھائیوں کے چرچے دور دراز تک مشہور ہیں لیکن ان کی پہنچ سے باہر ہے۔ اگر وہ دفتر کے کسی کام میں مصروف ہو بیوی چائے کی پیالی جوٹھا کپ جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں اس کی میز سے اٹھا لیتی ہے یا اس کے چھوٹے بچوں کی گیند کھیل کھیل میں اس کے کمرے کی دیوار سے ٹکرا جاتی ہے تو وہ کاغذ قلم چھوڑ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ بغیر یہ سوچے کہ گھر جتنا اس کا ہے اتنا ہی اس کی بیوی اور بچوں کا ہے...... جب کہ یہی بات پیار سے بھی کہہ سکتا ہے۔

آپ کے شوہر اگر خاموش رہتے ہیں آپ سے کچھ شیئر نہیں کرتے، آپ کی جانب

دیکھتے تک نہیں اس میں خرابی کیا ہے؟ آپ پر ہاتھ تو نہیں اٹھاتے، زدوکوب نہیں کرتے آپ کے جسم پر لال نشان نہیں چھوڑتے اس کی شکایت میں آپ کیا کہیں گے؟ اس کا آپ ایف۔آئی۔آر نہیں درج کرا سکتے۔ کیوں کہ بات نہ کرنا، چپ رہنا، نظر انداز کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ اسے اگر میں خاموشی میں تشدد ''وائلنس آف سائلنس'' سے تشبیہ دوں تو اسے ہنسی میں اڑا دیا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ ان فیمی نزم عورتوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ انھیں اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ ظلم ہی دکھائی دیتا ہے۔

مشہور مصنفہ منّو بھنڈاری نے بھی اپنی سوانح میں اپنے مشہور مصنف شوہر کے بارے میں لکھا ہے۔ ''یوں تو ہر شخص کے دو چہرے ہوتے ہیں لیکن کسی شخصیت کی دونوں شبیہ میں بہت فاصلے ہوتے ہیں۔ اتنا کہ اگر دونوں کو سامنے رکھ دیا جائے تو آپ شناخت بھی نہیں کر سکتے کہ یہ ایک ہی شخص کے دو چہرے ہیں''...... میں نہیں جانتی کہ کتنے لوگ اپنی ان دوہری شبیہ سے آگاہ ہوتے ہیں۔ راجندر تو مذکورہ حصار میں گھرا ہوا ہے۔ وجہ بھی واضح ہے۔ کیوں کہ ان کے دونوں شکل میں اتنا ہی فرق ہے کہ ان کی باہری شبیہ کو جاننے والے کبھی بھروسا ہی نہیں کریں گے کہ ان کا باطنی حصہ بھی ہے جو بہت بے رحم ہے اور غیر انسانی بھی۔ حقیقت میں راجندر کی انا اسے اپنے حصار سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ کیوں کہ وہ اپنی انا کے کھول سے باہر نہیں آسکتے۔ جب کہ راجندر جیسا حساس اور سمجھدار شخص اتنی سی بات نہیں جانے گا کہ پیار دراصل قربانی کا نام ہے۔ پیار کی انتہا خود کو فنا کر دینا ہے۔ کیا ان اوصاف کے بغیر پیار کیا جا سکتا ہے۔

کسی شخص کا اپنی ہی خیر خواہی اور اپنے عزیزوں سے لاتعلقی ایک غیر اخلاقی عمل ہے۔ جسے نفسیاتی زبان میں انا پرست شخصیت کا عدم توازن کہا جاتا ہے۔ کوئی شخص جب اپنے علاوہ کسی اور کے جذبات کو اہمیت نہیں دیتا تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوسروں کے درد کو سمجھنے کے سبھی دروازے بند کر چکا ہوتا ہے۔ بیشتر اہم شخصیات مذکورہ خامی سے گھرے ہونے پر بھی انجان ہوتے ہیں۔ منّو بھنڈاری نے اپنی کتاب ''ایک کہانی یہ بھی'' میں جب یہ اقتباس لکھا تھا۔ ''انا پرست اور اپنی دنیا میں گم راجندر نے زندگی میں نہ اپنے سوائے کسی کو پیار کیا نہ کر سکتے ہیں''۔ انھیں اس نفسیاتی اصطلاح کا بالکل بھی علم نہیں تھا۔

کشیدگی سے رونما ہونے والی بیماریاں

اس طرح کے غیر شناخت شدہ ذہنی کشیدگی، جسمانی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں۔ ہر جسم کا جو بھی اعضا کمزور ہوتا ہے وہ مذکورہ کشیدگی سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ کچھ عورتوں کو دمے کی بیماری زور پکڑ لیتی ہے۔ بدہضمی اور ایسی ڈٹی جیسی بیماریاں ہاضمے سے متعلق بیماریاں فوراً جسم کو کمزور کر دیتی ہیں۔ پائلس، پیٹ میں السر، سائینس، مائیگرین سبھی بیماریاں جسم میں ایڈرینل گلینڈ کے منفی رطوبت سے پیدا ہوتیں ہیں۔ اور یہ سبھی بیماریاں ذہنی اتھل پتھل اور کشیدگی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

کشیدگی سے پریشان گھر کی چہار دیواری میں سمٹی ہوئی لاتعداد عورتیں محسوس کرتی ہیں۔ گھر میں کھڑکیاں دروازے کھلے ہونے کے باوجود عورت اچانک گھٹن، سفوکیشن محسوس کرتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ گھر میں ہوادار جھروکوں اور روشن دان کی کمی ہے۔ وہ سانس نہیں لے پاتی۔ کیوں کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ کمرے میں آکسیجن نہیں ہے۔ کمرے سے نکل کر وہ بالکانی میں آتی ہے اور لنگس میں تازہ ہوا کھینچنے لگتی ہے۔

خواتین 'کارڈیولوجسٹ' اکثر بتاتی ہیں کہ کشیدہ ماحول سے نبرد آزماں ہوتی ہوئی اشرافیہ طبقے آسودہ حال عورتیں اچانک ای سی جی کرانے کلینک آجاتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ دل کی مہلک بیماری سے گھری ہیں۔ اور ان کی بیماری کی شناخت نہ تو وہ خود اور نہ ہی ڈاکٹر کر پاتے ہیں۔ جب ای سی جی کی رپورٹ نارمل آتی ہے تو وہ یہ مان لیتی ہیں کی یا تو ڈاکٹر غلط ہے یا مشین کیوں کی ان کے دل کی دھڑکن اچانک سے تیز ہوجانا اور کھلی فضا میں سانس لینے سے قاصر ہونا ایک صحت مند انسان کی علامت نہیں۔ وہ ہاضمے کی پرابلم سے انڈواسکوپی جیسے تکلیف زدہ چیک اپ سے گزرنے کو تیار رہتیں ہیں۔ کیوں کہ انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انٹڑیوں کے کینسر یا السر کی وجہ سے پریشان ہیں۔ وہ اپنی بیماری کو ذہنی دباؤ اور اہمیت نہ حاصل ہونے کی وجہ تسلیم نہیں کرتیں بلکہ جسم کے اعضا کی بیماریوں سے وابستہ کرتی ہیں۔ کچھ عورتیں سائکلوجسٹ کے پاس جاتی ہیں کیوں کہ خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے اپنے ماحول میں نہیں بلکہ انھیں خود میں ہی خامی محسوس ہونے لگتی ہے۔

ذہنی دباؤ میں لمبے عرصہ تک ملوث ہونے کی وجہ سے عورتیں اپنے جسم کو بیماریوں کا گھروندہ بنالیتی ہیں۔اور پھر ڈاکٹروں کے پاس جانا ہی انھیں سب سے بہتر لگتا ہے جب کہ انھیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان بیماریوں کا ڈاکٹروں کے پاس کوئی علاج ہی نہیں ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ عورتیں ڈاکٹرس کے پاس یا سائکلوجسٹ کے پاس ہی جاتی ہیں کیوں کہ برابر مایوس کن حالات میں رہنے کہ وجہ سے عورتیں خود کے جسم کی بناوٹ میں بیماری تلاش کرتی ہیں۔وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں کہ اس کے جڑ کہیں اور وابستہ ہیں اور ان کا علاج نہ تو ڈاکٹروں کے پاس ہے اور نہ ہی کسی سائکلوجسٹ کے پاس۔ان حالت سے نکلنا اس کے ہاتھ میں ہے لیکن پہلے وہ اس کی شناخت تو کرے کہ بیماری کی وجوہات کہاں مخفی ہیں۔

مذکورہ مشکلات کی جڑیں ہماری تہذیب میں اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ وہ ہماری تہذیب ہمارے وجود کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔اس لیے اس ظلم کے شناخت کے بنا ہی عورتیں اپنی ساری زندگی گزار دیتی ہیں۔یہ عورتیں کاؤنسلنگ سینٹرس پر اس وقت آتی ہیں جب ذہنی تشدد ایک لمبے عرصے کے بعد دشنام درازی یا جسمانی تشدد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

خانگی تشدد میں ملوث خواتین کو راستہ دکھانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے ذہنی تشدد برداشت کر رہی عورتوں کو سمجھانا، کیوں کہ اس حالت میں مرد بہت سمجھدار اور مطمئن نظر آتا ہے۔اس شخص کے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے روپ کی شناخت نہیں ہو پاتی جسے وہ عورت گھر میں برداشت کر رہی ہوتی ہے۔جو برابر اسے احساس کمتری اور مایوس کن ماحول سے ہمکنار کر رہا ہوتا ہے اور اس کے ٹیلانٹ کو کچل کر ختم کیے جا رہا ہے۔اول تو کاؤنسلنگ سینٹرس میں بلانے کے باوجود مرد کبھی نہیں آتے۔اگر آتے ہیں تو اپنا دوسرا خوش اخلاق چہرا لے کر آتے ہیں۔ایک ہی سانس میں یا تو وہ اپنی بیوی کی ساری خامیاں گنا دیتے ہیں۔اور کاؤنسلر کے سامنے کہتے ہیں کہ بدلنے کی ضرورت اسے ہے، مجھے نہیں۔یہ خوش رہنا نہیں جانتی، میں اپنی طرف سے اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔یا پھر بالکل خاموشی سے یہ باور کراتے ہیں کہ وہ ویسے نہیں ہیں جس طرح سے ان کی بیوی سب کے سامنے انھیں پیش کر رہی ہے۔

زیادہ تر غیر نوکری پیشہ عورتیں سمجھوتہ کر، گھر کو گھر بنائے رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔وہ

اپنے شوہر کی سارے ظلم وستم کو بھولنے کو تیار رہتی ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ نہیں کھونا چاہتیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے گھر کا تنکہ تنکہ ڈھونڈ کر لاتی ہیں اور اپنا گھر سنوارتی ہیں۔ شادی ہوتے ہی اس گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہیں کیوں کہ شروع سے انھیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ وہ گھر تمہارا گھر ہے۔ اس گھر کا اپنا ہونا انھیں اس قدر جکڑ لیتا ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کر لیتی ہیں لیکن گھر چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ جس کے ہر ذرے سے انھیں محبت ہو جاتی ہے۔ گھر کی چہار دیوار کے علاوہ شوہر کی شکل میں پانچویں دیوار ان کے سامنے آ جاتی ہے۔ اور اس سے دور ہونا ان کے غور و فکر سے بہت دور ہوتا ہے۔ کیوں کہ گھر کی چہار دیوار کے باہر اس کی کوئی دنیا ہے ہی نہیں۔

سب کچھ خوشی خوشی قربان کر دینے کے بعد بھی اچانک اس کا شوہر دوسری عورت کے زلف کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اور کسی کباڑ کی طرح اپنی بیوی کو گھر سے باہر کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے۔ کئی مرتبہ گھر کے سارے افراد کا خرچ اٹھانے والے مرد کے خلاف بچے بھی سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموش رہتے ہیں اور ماں کا ساتھ نہیں دیتے۔ گھریلو عورت کے لیے یہ طعن و تشنیع بڑا دھچکا ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو کر سائکلو جسٹ سینٹر پہنچ جاتی ہے۔ اور انھیں پہلے جیسی حالت میں واپس لانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا جاتا ہے۔

کچھ ذہنی امراض کے ہسپتال آپ جائیں تو آپ کو یہ اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ چالیس سال سے اوپر کی خواتین ایسی بیماریوں میں گھری ہیں۔ ایسی کئی شادی شدہ عورتیں جنھیں بنا کسی وجہ کے چھوڑ دیا گیا۔ یا ڈاکٹروں سے زبردستی پاگل ہونے کا سرٹیفیکٹ لے کر ہسپتالوں کی طرف دھکیل دیا ہے اور حد تو یہ ہے کہ ان کے ماں باپ اور بھائی بہن بھی انھیں نہیں پوچھتے۔ اور تھک ہار کر اپنی باقی زندگی مجنونانہ کیفیت میں گزار دیتی ہیں۔

دماغ پر اثر پذیر چوٹ انھیں بالکل ناکارہ بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ ذہنی تشدد کو ذیل کے کچھ مکالمات کی جانچ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

You dont have brains.

You are beauty without brains.

You are a brain less women.

''تجھ میں عقل کی بہت کمی ہے''

''عقل کی بات تو کبھی کرو گی نہیں''

''کبھی اپنی عقل کا استعمال بھی کر لیا کرو''

''تم میں عقل نام کی چیز ہی نہیں ہے''

''منہ مت کھولو ورنہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تمہاری عقل گھٹنوں میں ہے''

عورت اگر گھریلو قسم کی ہے تو اسے باہری معاملات پر زبان کھولتے ہی فوراً ٹوک دیا جاتا ہے۔ ایک طویل وقت تک اس کے اسپیس کو دال چاول، سبزی، بھاجی یعنی باورچی خانے تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ میرے دادا جی اکثر میری دادی کو ٹوکتے تھے۔'' تجھے جس بات کی سمجھ نہ ہو اس پر زبان مت کھولا کر۔''

یہی الفاظ کچھ الگ طریقے سے میرے والد میری ماں سے کہتے تھے۔'' کاروبار کی بات جہاں آئے تو اپنی صلاح مت دیا کر'' حالاں کہ بعد میں والد نے یہ بھی محسوس کیا کہ بزنیس سے متعلق ماں کا مشورہ ہی ہمیشہ صحیح ثابت ہوتا تھا۔

اس کے باوجود بھی کبھی ماں کو کسی بھی معاملے میں بولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

موجودہ دور کی خواتین تعلیم یافتہ ہیں۔ ہر سماجی اور سیاسی مدّعے پر اپنی رائے رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود مرد اسی دقیانوسی خیال کو صحیح ٹھہراتا ہے۔ جو اس کے باپ دادا طے کر کے گئے ہیں۔ آج بھی ایک شوہر اپنی گھریلو بیوی سے کہتا ہے کہ کاروبار سے متعلق اپنی رائے اپنے پاس ہی رکھو۔ یوڈونٹ ہیو اینی بزنس سینس۔ یا تمہاری اوقات کیا ہے۔

ایسے میں جب ایک بچہ اپنی ماں کے آنسوں پوچھتے ہوئے کہتا ہے۔'' کیا ہوا ماما، ایٹ لیسٹ پاپا آپ کو مارتے تو نہیں ہیں نا۔'' تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس آٹھ سال کے بچے کو بھی اس ماحول میں وہ دقیانوسی ذہنیت پروان چڑھ رہی ہے کہ پاپا اگر ماں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تو وہ اتنے برے نہیں ہیں۔ جتنا کہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہر وقت ڈانٹنے اور طعنے دینے کو جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

ان اعلیٰ متوسط طبقے کے اشرافیہ طبقے کے شوہروں کے گھروں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ شوہر اپنی گاڑی کی چابی یا کوئی ضروری کاغذ کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے اور اس کے لیے بیوی پر الفاظ کے

بے شمار ترکش چلاتا ہے کہ چابی کہاں رکھی ہے۔اس کے لیے وہ زمین آسمان ایک کر دیتا ہے۔وہ جب چیخ پکار کر اپنا چہرہ سرخ کر رہا ہوتا ہے۔بیوی چابی سے زیادہ شوہر کے بڑھتے ہوئے بی پی کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔آخر کار چابی شوہر کے جیب میں رکھی ہوئی ملتی ہے۔وہ جانتا ہے کہ چابی اس نے رکھی تھی پر اپنی چیخ پکار پر غلطی تسلیم کرنے کے بجائے ہفتوں بیوی سے بات کرنا بند کر دیتا ہے۔بیوی اپنے گھر اور باورچی خانے کے چھوٹے سے اسپیس میں کب تک جنجال سے لڑتی رہے گی۔آخر کار وہ شوہر سے بات چیت قائم کرنے کی کوشش میں اس غلطی کے لیے معافی مانگتی ہے جو اس نے کی ہی نہیں......اور یہ ایک روزمرہ کے حالات ہیں جس سے ہر گھریلو عورت دو چار ہوتی ہے۔

ایک پڑھی لکھی سمجھدار عورت کو بھی اسی طرح کاٹ چھانٹ کر اپنے سے نچلے درجے کا ثابت کرنا، بار بار اس کے لباس پر اسے احمق، بے وقوف بول کر اور دوسرے طنزیہ کلمات کے ذریعے اس کی فنکارانہ صلاحیت کو مجروح کرنے میں اہم کردار بیوی کے تعلیم یافتہ اور مہذب سمجھے جانے والے شوہر کا ہوتا ہے۔

اکثر و بیشتر دیکھنے میں بے حد خوبصورت اور سلیقہ مند عورت کا خاوند غیر محفوظ کن جذبے کے تحت زبانی طور پر جارحیت پر اتر آتا ہے۔اسی لیے وہ اپنے سپُر یرئیر ہونے کا دکھاوا کرتا ہے۔ایسے شوہر کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔اپنی احساس کمتری کو چھپانے کے لیے اپنی بیوی پر غصہ کرتا ہے۔اس کی گھر کی نوکرانیوں کے سامنے برا بھلا کہتا ہے۔اس پر بے بنیاد الزام تراشی کرتا ہے۔آخر کار وہ ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ایک کیس ہسٹری

اعلیٰ متوسط طبقے کی ایک مہذب خاتون سے صبح سیر کے دوران پہچان ہوئی۔ان کی عمر تقریباً ساٹھ کے قریب تھی۔اس عمر میں بھی وہ اپنی جوانی کی امیدیں کچھ مرجھائے ہوئے خواب آنکھوں میں سمیٹے ہوئے تھی۔بات کرنے میں مہذب اور سلیقہ مند۔اس کے گھر کی دیواروں پر خوبصورت پینٹنگس لگی تھیں۔جو اس نے شادی سے پہلے اور شادی کے دو چار سال بعد تک بنائی

تھی۔ پر اس کے چہرے پر ایک گم صم خیال جمع بیٹھا تھا۔ جسے کہتے ہیں ''لاسٹ لک'' ایسا جذبہ جو لمبے عرصے تک ''سینس آف نان بلا ننگ'' اور ''خفیف ظلم'' جھیلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ دو، تین دن کی پہچان میں ہی اپنی تکلیف خود ہی بیان کرنے لگی۔ ''سدھا آئی ہیوا بیوز ڈ مائی بواڈی سوچ۔ آئی ہیو پنشڈ اٹ۔ ٹارچرڈ اٹ۔ ناؤ مائی بواڈی ٹلینگ می نو مور! ٹیک کیئر آر آئی لیو اینڈ گو''۔ میں نے اپنے جسم کا، اپنی صحت کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ خود کو سزا دی، تکلیف دی۔ اب میرا جسم مجھ سے کہہ رہا ہے۔ بہت ہوا! اب مجھے سنبھالو نہیں تو میں چلا!

میں نے اس سے کہا تم اکیلی نہیں ہو سبھی عورتیں یہی کرتی ہیں اور کہیں تو زور چلتا نہیں۔ بس اپنے کو سزا دینے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور کوئی راستہ نہیں ہوتا ان کے پاس۔ خود کو تکلیف دے کر ہی انھیں خوشی ملتی ہے۔ گھر کو مٹنے سے بچائے رکھنے کی خوشی، اپنے کو تہس نہس کر کے بھی۔ اپنے کو قربانی سے ہمکنار کرنے کی خوشی اور بچوں کے سر پر چھت دینے کی خوشی۔

اس عورت کی شکایت تھی کی اس کے شوہر اس سے کبھی بات ہی نہیں کرتے۔ جب بھی وہ اس سے کہتے ہیں کہ مجھے بھی دنیا کی خبریں شیئر کرو جو اپنے دوستوں سے کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں ''یو ڈونٹ ہیوا ین، آئی۔ کیو۔ بات اس سے کی جاتی ہے جس میں بات سمجھنے لائق تھوڑی عقل ہو۔ ''آئی کین ٹاک اونلی انٹلی جینٹ پرسن'' تمہارے پاس عقل نام کی چیز نہیں میں صرف دانش مندوں سے بات کرتا ہوں۔

آگے بتانے لگی کہ بیس سال قبل جب کسی دوست کے میاں، بیوی ملنے آتے تھے۔ اور اس کے شوہر سے کہتے تھے۔ ''یو آر لکی سچ آ بیوٹی فل وائف'' آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی بیوی اتنی خوبصورت ہے۔ تو وہ ٹھہا کہ مار کر مزید خوبیاں گنا دیتے تھے۔ ''بیوٹی ودھاؤٹ برینس'' پھر اپنی بیوی کے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹ سنوارنے کی ادا کے ساتھ معافی مانگتے ہوئے کہتے ''ارے یار، میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' لیکن شادی کے مسلسل چالیس سال تک ''یو ڈونٹ ہیو برینس'' یا ''یو آر آ برین لیس ومین'' یا یو ہیو پلیوٹیڈ مائنڈ کا ہتھوڑا اپنے سر پر جھیلنے کے بعد ان کا دماغ آہستہ آہستہ حقیقت میں سن ہو گیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ یادداشت کمزور ہو گئی اور اپنی خود اعتمادی پوری طرح کھو بیٹھی۔ اچھی خاصی مصور ہوتے ہوئے بھی اس کی انگلیاں ایک سیدھی لکیر

تک کھینچنا بھول گئیں۔ سائکلوجسٹ کے پاس جانے لگی اور اینٹی ڈپریسینٹ گولیوں کی خوگر ہوگئی۔

اس کی شکایت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے بات بھی نہیں کر پاتی۔ گھر کے سیکڑوں مسئلے ہوتے ہیں پر صبح شوہر سے بات کرو تو وہ کہتا ہے میرے آفس جانے کے وقت ہی تمھیں گھر کے مسائل لے کر بیٹھنا ہوتا ہے۔ آفس سے وہ واپس آئے تب بات کرو تو پھر یہ کہ تھکا ہوا آیا ہوں چین سے بیٹھنے تو دو۔ چھٹی کے دن بات کرو تو وہ یا تو کرکٹ یا جغرافیائی چینل دیکھنے میں مصروف یا کراس ورڈ یا سڈوکو یا اخبار، اپنی شادی کی سال گرہ کے ایک دن ہلکے موڈ میں شوہر کو پیار کے نام سے آواز دے کر کہا ''اچھا تمھیں کرکٹ یا اپنی بیوی میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑ جائے تو؟۔

اس نے بنا پلک جھپکے ایک سانس میں کہا۔ ''کرکٹ اف کورس! دروازا کھلا ہے جا سکتی ہو'' اور انگلی کا اشارہ کھلے دروازے کی جانب کر دیا۔ وہ عورت یہ واقعہ سناتے ہوئے روندھے ہوئے گلے سے کہہ رہی تھی کہ یک دم من ہوا کہ ابھی گھر چھوڑوں اور نکل جاؤں ؟لیکن کہاں؟ اچھی خاصی ذہین پڑھی لکھی عورتیں بھی شادی کے بعد گھریلو عورت بن کر اپنے واپس ہونے کے سارے دروازے خود بند کر دیتی ہیں۔

یہ کسی ایک عورت کی کہانی نہیں ہے ہزاروں پڑھی لکھی سمجھدار عورتیں اپنے ایلٹ اور روشن خیال شوہروں سے سال در سال چوبیس گھنٹے ایک سے بڑھ کر ایک مقولہ سنتی آتی ہیں کہ ان میں عقل کی کمی ہے۔ کہ وہ بے وخوف ہیں، وہ کسی کام کی نہیں ہیں، وہ ہر وقت تنقید کرتی رہتی ہیں۔ اور آخر میں وہ تسلیم کر لیتی ہیں کہ حقیقت میں ان میں کوئی خامی ہے، ان کا آئی۔ کیو۔ نچلے درجے کا ہے۔ احساس کمتری ان کے اذہان کو معدوم کر دیتا ہے۔ گھر آئے مہمانوں کے بیچ وہ بات کرتے ہوئے ڈرتی ہیں کہ پتا نہیں اس دانشمندانہ گفتگو میں وہ کوئی احمقانہ بات نہ کہہ دیں اور ان کے شوہر ان کی کون سی بات پر ناراض ہو جائیں اور وہ سب کے بیچ مذاق بن بیٹھیں۔ کام کرنے یا لکھنے یا پڑھنے کا جذبہ بھی اس زبردستی پیدا کی گئی احساس کمتری کی وجہ سے دم توڑ دیتا ہے۔

ایک قبائلی تہذیب ہے کہ ایک درخت کو اگر کاٹنا ہے تو اس پر آری یا کلہاڑی نہیں چلاتے بلکہ کچھ قبائلی مرد عورتیں اس درخت کے ارد گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور

درخت کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ تو سوکھ جا، تو مر جا، تجھ پر خدا کا قہر برسے۔ گالیاں دیتے ہیں اور کوستے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں اس درخت کے پتے سوکھنے لگتے ہیں اور وہ اپنے آپ ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ یہی حال ان عورتوں کا ہوتا ہے جنھیں ہر روز خالی دماغ یا احمق ہونے کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔

حیرانی اس بات کی ہوتی ہے کہ عورتیں اپنے اندر ان جھوٹے اور بے بنیاد الزامات کو بٹھنے کیوں دیتی ہیں؟ اور ایک دن وہ حقیقت میں یقین کرنے لگتی ہیں ان کے دماغ میں کوئی مہلک بیماری ہے۔ کہ ''دے آر بیوٹی ودھاوٹ برینس'' ان کے دماغ میں آلودگی بھری ہے۔ یہ سب مسلسل سنتے رہنے سے ان کا دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ ذہنی کشیدگی کی وجہ سے ان کی سوچنے کی طاقت کند ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظلم برداشت کرنے کی وجہ اسے وراثت میں ملی تہذیب، گھر اور بچوں کو بچائے رکھنا ہوتا ہے۔ جہاں ذہین اور کامیاب شوہر کو پانا ہی اس کا واحد مقصد ہوتا ہے۔ اور اس رشتے کو بچانے کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی اپنی سانس لینے کے حقوق کو داؤں پر لگا دیتی ہے۔

ایسے مردوں کا ایک اور مشہور مقولہ ہے۔ ''تم ہو کیا تمہاری اوقات کیا ہے؟'' اپنے سے زیادہ یا اپنی پوسٹ سے زیادہ کام کرنے والی ذہین عورت کو بھی یہ کہنے میں بھی نہیں شرماتے کہ ''تمہاری اوقات کیا ہے'' یہ بہت سے شوہروں کا پسندیدہ مقولہ ہے۔ وہ اپنی اوقات سے اس قدر مطمئن ہوتے ہیں کہ وہ آنکھیں بند کر بیوی کے وجود کو طنزیہ القاب سے روندتے رہتے ہیں اور خود کی انا میں ڈوب جاتے ہیں۔

مسلسل بولے جانے والے طنزیہ مقولے بہت ہیں اور ان میں سے ایک کہ تم کون سا دودھ کی دھلی ہو! شوہر کے ظلم سے عاجز آ کر جب کوئی عورت اپنی الگ شناخت قائم کرنی چاہتی ہے تو مرد اس کے کردار پر چھری رکھ دیتا ہے۔ جب بھی شوہر کی عیاشی یا اس کی نفس پرستی پکڑی جاتی ہے۔ وہ فوراً اپنے کردار کے داغ چھپانے کے لیے بیوی کے کردار پر الزام تراشی شروع کر دیتا ہے۔

اپنے گناہوں کی لکیر کو چھوٹا ثابت کرنے کے لیے بیوی کے گناہوں کی لمبی فہرست گنا کر خود کو مطمئن کر لیتا ہے۔ اپنی بیوی کو جھوٹا اور بدچلن کہنا ان کمزور مردوں کا ہتھیار ہے، جو خود کی

خامیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔جارحانہ رخ اختیار کرنا محفوظ کن حربہ ہے۔14 جولائی 2012 کو بینگ لور کے ایک دانت کے ڈاکٹر کا معاملہ اخبار میں شائع ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو بدصورت بو ل بول کر جہیز مانگ رہا تھا۔اپنی بیوی پر شک کرتا تھا اور وفاداری ثابت کرنے کے لیے بیوی کو اپنا پیشاب پینے پر مجبور کیا۔فرسٹیشن اور زعم انسان کو تشدد کی خوفناک صورت حال تک پہنچا دیتا ہے۔یہ بیوی تو اپنی شکایت لے کر تھانے پہنچ گئی لیکن ایسی نہ جانے کتنی عورتیں ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے تشدد کو ذاتی مسئلہ کہہ کر گھر کی چہاردیواری میں ہی دفنا دیتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے ظلم کا شکار نہیں ہوتے۔کئی بار دیکھا گیا ہے کہ مرد اپنی نوکری پیشہ دبنگ بیویوں کے ناجائز تعلق پر سماجی ڈر کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی عورتیں مردوں سے بھی زیادہ خونخوار اور سیڈیسٹ ہوتیں ہیں۔ایسی عورتوں کے ننگے ناچ کے آگے دس مردوں کا ظلم پھیکا پڑ جائے۔شوبازی اور مادہ پرستی کے بڑھتے قدم کی وجہ سے ہمیں ایسی عورتوں کے گروہ سے متعلق بات کرنی ہے۔دراصل پدر شری نظام انھیں عورتوں کی جابرانہ،اور دبنگ کردار کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔جب کوئی مرد اپنی بیوی کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے تو اس کے پیچھے زیادہ تر اس کی ماں،بہن کے علاوہ دسری عورت جو مرد کو بیوی کی کمزوریوں کی شناخت کر مردوں کو اکساتی ہیں۔لیکن کیا اس میں شوہر کا گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔؟ایک مرد جب دوسری عورت کے بہکاوے میں آ جاتا ہے اپنی غور وفکر کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور اس کے اشارے پر گھومنے لگتا ہے اور اپنی بیوی پر بے وجہ کھولتا رہتا ہے۔اس عمل میں اس کے گناہ کو کم نہیں سمجھنا چاہیے۔لیکن جب ہم کسی عام معاشرتی مسئلے پر بات کرتے ہیں اعداد شمار کے مطابق ہی نظریات طے کرتے ہیں۔اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ذہنی تشدد کے معاملے میں اعداد و شمار 95/5 کا ہی پایا گیا ہے۔ہوسکتا ہے اس میں اضافہ ہو رہا ہو۔لیکن ہمیں یہاں اس بڑے اعداد و شمار کی بات کرنی ہے مفروضات کی نہیں۔حالاں کہ دونوں سے نمٹنے کے طریقے ایک ہی ہیں۔وہ مرد کے لیے ہوں یا عورت کے لیے۔جو فریق مزاحمت کرنے میں کمزور ہوگا وہ ظلم وتشدد

برداشت کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔

پاور اسٹپس ۔ آخر آؤٹ لیٹ کہاں ہے

یہ سوال ضرور اٹھایا جاتا ہے کہ آخر عورتیں خود کو کیوں سزا دینے لگتی ہیں؟ اور کوئی راستہ کیوں نہیں ہوتا ان کے پاس؟

جب دل مضطرب ہوتا ہے اپنے آپ سے ڈر ہونے لگتا ہے۔ کہ بلا وجہ توڑ پھوڑ نہ کر دیں، کسی پر برس نہ پڑیں۔ تو یہ اضطراب باہر کیسے آئے گا؟ کس پر زور چلے؟ ظاہر ہے گھر کے مالک پر تو بالکل نہیں چاہے وہ سسر ہو جیٹھ یا کوئی اور بزرگ، کیوں کہ وہاں زور نہیں چلتا۔ ساس پر؟ نہیں، کیوں کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے۔ ہر حال میں عزت کی حق دار ہے۔ ہماری ماؤں نے اس نسل کو یہی باور کرایا ہے۔ کہ ساس کو ماں کی طرح سمجھو۔ شوہر پر؟ سوال نہیں۔ وہ تو گھر کا جہاں پناہ ہے۔ روزی رساں ہیں۔ سپریٹ فیملی میں انھیں کی حکمرانی چلتی ہے۔ بچا کون؟ اپنی مایوسی اور غصہ کہاں نکالے؟ بچوں پر؟ ایک تو وہ اتنے معصوم ہوتے ہیں، دوسرے باپ کا پیار نہیں ملتا انھیں، اس لیے دوہری ذمہ داری عورت کی بنتی ہے کہ وہ انھیں باپ کے پیار کی کمی محسوس نہ ہونے دے۔ اور وہ گھر پر رہتے نہیں اچھا ہی ہے کہ رہتے نہیں ورنہ وہ معصوم ہی شکار ہوتے ہیں مذکورہ خلل کا، اس الجھن اور پریشانی کا۔ لیکن پھر بھی یہ معصوم بچے ہی عورت کی مایوسی کا شکار بنتے ہیں۔

متوسط طبقہ اور اعلیٰ متوسط گھروں میں جہاں کام کرنے والے موجود ہوتے ہیں وہاں ساری گڑبڑی کا شکار ہوتی ہے۔ بیچاری نوکرانی جو بنا جرم کے اور اپنی غریبی کی وجہ سے آٹے میں گھن کی طرح پستی ہے۔ بچے بھی اپنا سارا غصہ نوکرانی، مالی، اردلی پر اتارتے ہیں، کیوں کہ گھر میں وہی ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو اوپر پاتے ہیں۔

اگر کام والی نے میز صفائی سے نہیں سجائی یا چمچ سلیقے سے نہیں رکھے یا سبزی صحیح انداز سے نہیں کاٹی تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اسے اتنی ہی سمجھ ہوتی تو آپ کے یہاں اتنے کم پیسوں میں کام نہ کرتی۔ بلکہ کسی بہتر جگہ ہوتی۔ نوکرانی پر زیادہ ناراضگی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے کام ترک کر دینے کا اندیشہ ہے۔ پھر بھی گھر کی مالکن اسے بخشتی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس گھریلو

عورت کا بھی گھر میں وہی دوئم درجہ ہے جو اس نوکرانی کا ہے۔ایک دوئم درجہ دوسرے دوئم درجہ پر غصہ اتار کر تھوڑا سا اونچا اٹھنا چاہتا ہے۔گھریلو تشدد کی ورکشاپ میں ہم درج ذیل موضوع پر بات کرتے ہیں۔

1۔ساس،2۔سسر،3۔شوہر4۔عورت،5۔بچے،6نوکر،آیا۔

متحدہ خاندان کے سب سے پہلے نمبر پر گھر کا سرپرست ،سسر ،جیٹھ یا دوسرے بزرگ۔دوسرے پر ساس۔اس کے بعد شوہر کا نمبر آتا ہے۔لیکن مذکورہ لوگوں میں بری حالت گھر کی عورت کی ہوتی ہے۔جسے موقع ملتا ہے وہ اس پر برس پڑتا ہے۔اب یہ عورت جو گھریلو چکی میں پس رہی ہے،اوپر سے تین لوگوں کا دباؤ برداشت کرتی ہے۔اس کے لیے آؤٹ لیٹ ہے جو اس کے نیچے معصوم بچے جن پر وہ اکثر برس پڑتی ہے پر اس کا دل بچوں کی طرف مائل ہوتا ہے تو خوب زیادہ پیار کرتی ہے۔دونوں ہی حالت ناموافق ہیں۔بچوں کو زدوکوب کرنا بھی اور انھیں پیار کی انتہا میں خراب کر دینا۔ایسا کرنے سے بچے ہمیشہ تذبذب میں رہتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے کہ ماں ان پر بے وجہ جھنجھلاتی رہتی ہے اور پھر بے وجہ زیادہ پیار کرتی ہے۔

بچے بغیر کسی جرم کے ہمارے کشیدگی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں سارا دن گھر میں مصروف رہتی ہے۔اور والد،دادی سے ڈانٹ بھی پڑتی ہے۔ماں کے لیے نرم گوشہ ہونے کی وجہ سے انھیں ماں کی بلند آواز سے شکایت بھی نہیں ہوتی۔بچپن سے ہی ان کے ذہن میں جانے انجانے میں برداشت کی قوت گھر کر لیتی ہے۔ایسے گھروں کے بچے اپنے ماں باپ کی کشیدگی سے دور ہونے کے لیے جلد بازی میں اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

دلت مصنفہ 'کوسلیہ بیسنتری' کی بیٹی 'سجاتا پارمیتا' نے بتایا کہ جس دن میری ماں والد سے مار کھاتی تھی۔اگلے دس دن تک مجھے پیٹ، پیٹ کر وہ اپنا غصہ نکالتی تھی۔کیوں کہ بیٹوں کو مارنا نہیں چاہتی تھی اور نوکر نوکرانی گھر میں تھے نہیں تو لے دے کر ایک بیٹی ہی دستیاب تھی ہر وقت مار کھانے کے لیے۔یہ مار پیٹ اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ سجاتا نے ماں کی مار سے محفوظ رہنے کے لیے پہلے ہی محبت سے فوراً شادی کر لی اور وہ شادی ہی اس کی کشیدگی ،بیماری اور زندگی ختم ہونے کا سبب بنی۔

عورت کو باہری دنیا سے جدا کرنا

پدرسری نظام سے وابستہ مرد اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔اس لیے وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی بھی نوکری کرے۔شادی کے بعد نوکری پیشہ عورتوں کو کسی نہ کسی بہانے سے ترک کروادیا جاتا ہے۔محدود کمائی کرنے والے مرد کی عورت کو اہل خانہ کی ذمہ داریوں کا بہانہ کر کے نوکری سے منع کر دیا جاتا ہے۔شادی کے بعد وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو پیار کی گھٹی پلا کر آسانی سے راضی کر لیتا ہے کہ نوکری سے زیادہ اہم گھر والے ہیں اور وہ بخوشی نوکری سے کنارہ کش ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عورت اگر نوکری کرے گی تو اس کا تعلق باہر کے لوگوں سے ضرور ہو گا۔ اور ایسے بہت کم شوہر ہوتے ہیں جو بیوی کے ٹیلنٹ کو دکھانے کا موقع دیں۔وہ اسے اپنے انگوٹھے کے نیچے ہی رکھنا چاہتے ہیں۔اس لیے سب سے کارگر طریقہ یہ ہے کہ بیوی کے برتھ ڈے پر اسے لذیذ کھانوں کی کتاب دے کر ذائقے دار کھانا تیار کروانا اور پورے گھر کو پانچ ستارہ ہوٹل کی طرح مزین کرنے میں مصروف رکھا جائے۔گھر میں آئے مہمانوں کے سامنے اس کی خوش سلیقگی اور لذیذ کھانے کی تعریف کر اس کا اہم اسپیس چولہا چوکہ ہی کر دیا جائے۔باورچی خانہ کے محدود دائرے میں رہ کر اپنے ٹیلنٹ کو فنا کر وہ صرف اس بات پر مطمئن رہتی ہے کہ اس کے شوہر اور بچے خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔شوہر اور بچوں کے لیے لذیذ کھانا تیار کرنا اسے زندگی کا سب سے اہم کام معلوم ہونے لگتا ہے۔

عورت امور خانہ داری میں بغیر رقم کا اعجاز حاصل کرے سارے ارمانوں کو مار کر پوری زندگی ختم کر دیتی ہے۔اپنے وجود کی جب اسے سدھ بدھ ہوتی ہے تب وقت بہت دور جا چکا ہوتا ہے۔زندگی کے آخری ایام میں شوہر اسے کبھی بھی طعنہ وتشنیع سے نواز سکتا ہے کہ شادی کے بعد سے اسے مسلسل دو وقت کی روٹی دے رہا ہے۔اور باہر جا کر چار پیسے لا کر دکھائے۔عورتیں چالیس سے پچاس سال کے بعد شوہر کے طعنہ زنی اور باہر کمانے کو سن کر، اس قدر رنجیدہ ہو جاتی ہیں کہ سائکلو جسٹ سینٹر پر پہنچ جاتی ہیں یا پھر حقوق خواتین سے متعلق سینٹرس کا رخ کرتی ہیں۔مذکورہ عورتوں کو اپنے شوہر کے لیے دی گئی قربانی، ایک ٹیس بن جاتی ہے۔

عموماً جنگی میدان: کھانے کی میز

اس زمرہ میں شامل مردوں کا جنگی میدان کھانے کی میز ہے۔ بیوی پر ظلم کرنے کا سب سے بڑا موقع ہے۔ کھانے کی میز پر آنے سے پہلے وہ برا چہرہ بنا کر آتے ہیں، اس مفروضات کے ساتھ کہ کھانا ان کی مرضی کے، مطابق نہیں بنا ہے۔ روز بہ روز کھانے میں خامی نکالنا بہت آسان ہے۔

کھانے میں نمک کبھی کم ہے کبھی زیادہ ہے، کوئی سبزی ہر تیسرے دن بن جاتی ہے تو کوئی مہینوں کیوں نہیں بنی؟ کبھی زیادہ پکی ہوئی ہے کبھی کچی رہ گئی ہے۔ کبھی مصالحہ کم مقدار میں ہے تو کبھی زیادہ۔ کبھی سبزی کی رطوبت ہلکی رہ گئی ہے تو کبھی گاڑھی ہے۔ کبھی چکن مٹن بھی آلو کی سبزی کی طرح بن جاتا ہے تو کبھی سبزی گھاس پھوس کی مانند لگنے لگتی ہے۔ زیادہ تر گھریلو عورتوں کا یہ روزمرہ کا مسئلہ ہے کہ کھانا کیا پکایا جائے اور کیسا پکایا جائے کہ ان کے شوہر خوش رہیں۔ لیکن وہ کتنی بھی کوشش کرلیں کھانا پکانے کی ساری ترکیب استعمال کرلیں وہ شوہر کی ماں جیسا کھانا نہیں بنا پائیں گی ۔ کیوں کہ کھانا کبھی اس طرح تیار ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ شوہر کی ماں بناتی ہے یا بناتی تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں ساس، نند اس میں بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ ان کے گھر میں داخل ہونے والی یہ نئی لڑکی جس ماحول سے وہ وابستہ رہی ہے، جسے جڑ سے اکھاڑ کر نئی مٹی میں لگایا گیا ہے۔ الادین کے چراغ کے گھستے تو اس میں فوراً تبدیلی تو نہیں لائی جاسکتی۔ اور اس نئی لڑکی سے یہ کیوں کہا جائے کہ فوراً اس نئے گھر کے نظام سے تال میل بٹھالو۔

عورتیں اس مقولے کو سچ تسلیم کرلیتی ہیں کہ مرد کے دل تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ ”The way to a mens heart through his stomach“ یہ بات عورتیں سمجھ نہیں پاتی کہ کھانا اہم وجہ نہیں بلکہ اسے الجھائے رکھنے اور کشیدگی بنائے رکھنے کا بہانہ ہے۔ اسے سمجھنے کے بجائے وہ نئے سے نیا کھانا بنانے اور کھانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا ایکسپریمنٹ کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود شوہر حضرات کھانا کھائے بغیر اٹھ کر چلے جاتے ہیں یا منھ بنا بنا کر کھاتے ہیں یا گھر کا پکا ہوا کھانا ایک طرف کر کسی مہنگے ہوٹل سے کھنا آڈر کر دیا جاتا ہے۔

کئی مرتبہ ناراضگی ظاہر کرنے کا یہ طریقہ آزمایا جاتا ہے کہ شوہر دو چار دن کی بھوک ہڑتال پر چلا جاتا ہے۔ وہ بیوی کی کمزور نبض کی شناخت کر لیتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ شوہر خالی پیٹ نہیں رہے گا، بیوی خود کو ملزم ٹھہراتی ہے۔ شوہر کا بغیر کھائے گھر سے نکل جانا اسے اپنی ناکامی کا زبردست احساس دلا دیتا ہے۔ شوہر کے پاس باہر کی ایک بڑی دنیا ہے۔ وہ بیوی سے ناراض ہو کر بریفکیس اٹھا کر گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔ آفس جا کر اچھے ناشتے کا آرڈر دیتا ہے۔ اور یہ بھول جاتا ہے کہ جس عورت کی مکمل کوشش اسی میں رہتی ہے کہ اپنے شوہر کو کس طرح سے لذیذ کھانا کھلا کر خوش کرنا ہے۔ اسے روتا بلکتا چھوڑ آیا ہے اور عورت اپنی گھریلو زندگی میں خود کو کوستی رہتی ہے۔

ناراضگی کا زیادہ دکھاوا کرنا ہو تو کھانے کی پلیٹ کو میز سے اچھال کر دیوار پر مبہم مصوری کی جائے۔ یہ شوہر سب کچھ کر سکتا ہے لیکن اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھانے کی غلطی کبھی نہیں کرتا۔ ایسی ہی عورتوں کی آنکھوں میں آنسوں دیکھ کر بچے کہتے ہیں۔ ''تو کیا ہوا ماما، آخر کار پاپا آپ کو مارتے تو نہیں ہیں نا''۔

اوسطاً جنگ کے کئی اور محاذ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بچوں کی پڑھائی لکھائی، بیوی کا پہناوا یا گھر کی دیکھ بھال، اگر مرد کو شکایت ہی کرنی ہے تو اپنی کمائی کا رعب دکھا کر کسی بھی بات پر شکایت کر سکتا ہے۔ اور اسے اپنا حق بھی سمجھتا ہے۔ اسے ایک طرح کا سیڈٹ مزاج بھی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں اپنے قریبی شخص کو دکھ درد دے کر ہی مرد اپنی انا کو پرسکون کرتا ہے۔

سپریم کورٹ کی وکیل اندرا جے سنگھ کے مطابق۔ ''ظلم کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ شوہر بیوی کو جسمانی تعلق سے محروم رکھتا ہے۔ شادی شدہ عورتوں کی غیر تحریر شدہ ضابطۂ اخلاق کے مطابق عورتیں سیکس کی ڈمانڈ نہیں کرتیں۔ صرف سیکس کی منظوری دیتی ہیں۔ قانون کی اپنی حد ہے اور دنیا کا کوئی بھی قانون سیکس کرنے کے لیے زور نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی اسے ظلم کے کسی خانے میں شمار کرتا ہے۔

معاشی آزادی: دہری ذمہ داری

گھریلو عورتوں کی زندگی میں مرد کی کمائی کا مطلب ہے اس کے زیر تسلط میں رہنا۔ کیوں کہ ہندوستانی معاشرے میں گھر کی ذمہ داری سنبھالنا دوئم درجے کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ مرد ہی نہیں خود عورتیں بھی تسلیم کرتیں ہیں۔ ایک عورت کو گھر بہتر طریقے سے چلانے پر انھیں

جوعزت دی جانی چاہیے وہ نہیں دی جاتی۔ کیوں کہ عورت نے اپنے حق کے لیے آواز بلند نہیں کی۔

موجودہ عہد کے حالات تبدیل ہوئے ہیں۔ باہری سرگرمیوں میں عورت کا عمل دخل فروغ پا رہا ہے۔ معاشی آزادی نے عورت کو دہری، تہری ذمہ داری میں جکڑ دیا ہے۔ اور مرد، عورت کی اس معاشی آزادی کو چیلنج کے طور پر دیکھتا ہے۔ اپنی احساس کمتری کو چھپانے کے لیے نہ صرف غیر ذمہ دار ہو جاتا ہے، بلکہ اسے دل میں بیوی کے لیے شک سانپ کی پھنکار کی طرح ظالم بنا دیتا ہے۔ ان عورتوں پر ظلم کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ کام سے واپس آنے میں دیر ہو گئی تو گھر میں ہنگامہ ہو جاتا ہے۔

بیوی کو اگر نوکری میں ترقی ملتی ہے تو شوہر اس کا سہرا اس کی قابلیت کو نہ دے کر باس کو خوش رکھنے کی وجوہات میں تلاش کرتا ہے۔ یہ شک کی یہ لاعلاج بیماری سبھی طبقے کے مردوں میں ہے۔ بالکل نچلے طبقے سے لے کر اعلیٰ طبقے کے مردوں کو اس سوچ سے بالکل جدا نہیں کیا جاسکتا۔ سولہویں صدی کا ''اوتھلو' صرف شیکسپیئر کے وقت تک محدود نہیں ہے۔ موجودہ دور کی اکیسویں صدی کے مردوں میں بھی ''اوتھلو' موجود ہے اور یہ قصبے کے نیم تعلیم یافتہ لوگوں میں ہی نہیں، جامعات کے وائس چانسلروں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں تک یہ زہر پھیلا ہوا ہے۔ معصوم کلیاں یہ نہیں سمجھ پاتیں کہ پرکشش شخصیات کے سپرد ہوتے ہی ان کی زندگی زہر آلود ہو جائے گی۔

معاشی اعتبار سے خودکفیل عورتیں بھی جذباتی طور پر اتنی ہی کمزور ہوتی ہیں جتنی کہ گھر پر رہنے والی عورتیں۔ گاؤں سے لے کر شہر تک کی تمام پڑھی لکھی اور غیر تعلیم یافتہ عورتیں اپنے شوہر کے شک کی بنا پر وہ کمزور اور بیمار ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ایک عورت اپنے شوہر سے تمام عمر جذباتی طور سے منسلک ہوتی ہے۔

کچھ پودے دیکھنے میں بہت نازک، ملائم پتیوں والے ہوتے ہیں لیکن ان کی ٹہنیوں کو کہیں سے بھی کاٹ دو ان کٹی ہوئی جگہ سے ہی پھر ہرے ہرے نازک پتیاں نکل آتی ہیں۔ کہیں سے بھی کاٹ دو چھیل دو پھر اسی چھلی ہوئی جگہ پر ملائم سی نمی ہری بھری ہونے لگتی ہے۔ سب کچھ بھلا کر پیار دینے کے لیے عورت ہمیشہ کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن انا پرست شوہر اپنے اردگرد ایسی دیوار بنا لیتا ہے کہ سامنے والا اگر پیار لٹانا چاہے بھی تو اس دیوار کو توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اس تک صرف وہی پہنچ سکتا ہے جسے وہ اپنے ناقابل تسخیر قلعے میں آنے کی اجازت دے۔

سماجی ساخت کے لیے پریشان مرد

مذکورہ تجزیاتی پہلو سے یہ بات تو صاف ہے کہ پدرسری نظام میں مرد کی شبیہ جابر و ظالم کی ہے۔اس لیے ظلم وتشدد کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم وجوہات کی تہہ تک جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ساری خرابی ہمارے معاشرے کی ہے۔جس میں مردوں کو بچپن سے ہی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ عورتوں کے بالمقابل زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور یہ دقیانوسی خیال اس کے دل و دماغ میں اس قدر گھر کر لیتے ہیں کہ وہ چاہ کر بھی چھٹکارا نہیں حاصل کر پاتا۔آخر کار وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے ایسا ماحول بنالیتا ہے جو تاریکی کی طرف لے جاتا ہے۔

اکثر ہم سماج میں یہ مقولہ سنتے ہیں کہ جو مرد اتنا بردبار با اخلاق ہے وہ اپنی شریک حیات کے لیے کیوں ظالم ہوسکتا ہے۔اگر وہ مرد خود کا محاسبہ کرے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ بچپن سے ملی تعلیم وتربیت کا اتنا خوگر ہو گیا ہے کہ دوسروں کے لیے تو وہ بلند ترین انسان ہے۔لیکن اپنی بیوی کے لیے ایک ظالم سے کم نہیں۔ایسے مرد اپنے اردگرد معاشرتی نظام سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود باہر نہیں نکل پاتے۔درحقیقت وہ پدرانہ نظام اور مردانہ سوچ کا خود ہی وکٹم ہے۔اپنی انا میں اس قدر ڈوبا ہوتا ہے کہ اس سے باہر آ ہی نہیں پاتا۔جو لوگ ایسے ماحول کے برخلاف اپنی لائف اسٹائل تبدیل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ان کے بیوی بچوں کو ایک خوش گوار ماحول مل جاتا ہے اور بچوں کی صحیح طریقے سے نشونما ہوتی ہے۔

دوستو وسکی نے کہا تھا کہ آخر کار خوبصورتی ہی اس دنیا کو بچائے گی۔ان کے اس مقولے کا مطلب عورتوں کی خوبصورتی اور نرم مزاج سے تھا یا نہیں، پورے وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ سچ ہے کہ عورتیں ہی اس دنیا کو بدل سکتی ہیں، کیوں کہ عورتوں میں اتنا دم خم ہے کہ وہ اپنے پیار و محبت سے لبریز جذبے کے ذریعے معاشرے میں پھیلی انارکی کو دور کر سکتی ہیں۔

حالات میں تبدیلی اس وقت ممکن ہے۔جب ہندوستانی مردوں کی ذہنیت بدلے گی۔ اور اسے بدلنے میں سب سے بڑی ذمہ داری ایک عورت کی ہی ہے۔وہ جب بیٹے کو بیٹی سے اونچا درجہ دیتی ہے۔بیٹے کو گھر کے کام میں شریک نہیں کرتی۔اپنی بیٹی کے لیے الگ پیمانہ بناتی ہے اور بہو کے لیے الگ تو عدم مساوات کے بیج وہ خود بوتی ہے۔ایک ماں اور ساس کی شکل میں وہ

دہرے پیمانے نہ اپنائے۔ وہ کیوں چاہتی ہے کہ اس کا داماد بیٹی کے ارد گرد گھومتا رہے۔ اس کی بیٹی کے ناز نخرے اٹھائے۔ اسے ہتھیلیوں پر رکھے۔ لیکن اس کا بیٹا یہی سب کرے تو وہ الزام لگاتی ہے کہ بیٹا بیوی کا غلام ہو گیا ہے۔ ایک عورت خود اپنی ساس کا ظلم برداشت کرتی ہے اور خود ساس بنتے ہی اس کی نقل کرنے لگتی ہے۔ بھابھی بن کر اپنی نند کا ظلم برداشت کرتی ہے اور خود نند بن کر بھائی کے ظلم کو برا نہیں کہتی ہے۔ جب تک ایک عورت میں دوسری عورت کا دکھ درد نہیں شامل ہوگا تب تک ہندوستانی معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ایک ماں کو چاہیے کہ بچپن سے ہی اپنے بیٹوں کو عورت کو عزت دینے کی تلقین کرے۔ گھر کے کام کو کم تر نہ سمجھا جائے۔ بیٹوں میں شروع سے ہی ایسی تہذیب گھر کر جائے کہ خود کو اپنی بہنوں سے برتر نہ سمجھیں۔ اپنے ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کو کمزور نہ سمجھیں۔ جنس کی بنیاد پر بٹوارا نہ ہو۔ آج اگر خواتین بھی گھر کا معاشی بار اٹھا رہی ہوں تو باورچی خانے کی ذمہ داری عورتوں تک ہی کیوں محدود ہو۔ جب تک مساواتی جذبہ میاں بیوی میں نہیں پیدا ہوگا تب تک فیملی نام کے ڈھانچے کا ختم ہونا طے ہے۔

آخری راستہ کیا ہے؟

مرد کی برتری قائم کرنے والی سماجی ساخت جب تک تبدیل نہیں ہوتی۔ اس وقت تک عورتوں کو اپنی فیملی بچائے رکھنے کے لیے کچھ مثبت قدم تو اٹھانے ہوں گے۔

جذباتی انسیت اپنی جگہ ہے اور اس کا تعلق عورت کی جسمانی بناوٹ سے ہے۔ ذہنی تشدد سے نمٹنے کے لیے بھی ایک عورت کو اپنا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ شوہر کے مزاج کو اور اس کے خاندان کے ماحول کو ذمہ دار ٹھہرا کر اسے درکنار نہیں کیا جا سکتا۔ مکالمات کو روکنے والی وجوہات کی شناخت ضروری بھی ہے۔ جب تک شناخت نہیں ہوگی اس وقت تک مشکلات کو دور کرنا ممکن نہیں۔

جس طرح جارحیت کے خلاف ایک عام عورت کو یہ بتا کر تیار کیا جاتا ہے کہ وہ پہلی ہی بار میں اپنی طرف اٹھے ہاتھ کو روکے۔ ہلکی مزاحمت کرنا اسے مستقبل میں ہمت دینا ہے۔ اور یہ ہمت دے کر وہ اپنی پوری زندگی ایک جلاد کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور جسم میں ذرا بھی طاقت

رہنے تک پٹتی رہتی ہے۔اسی طرح نظر انداز کرنا اور خاموش رہنا بھی ایک طرح کا ظلم ہی ہے ۔جسے میں خاموش تشدد یا سائلنٹ وائلنس کا نام دے رہی ہوں اور اسے بھی گھیرنے کی ضرورت ہے۔ایک مرد سالوں اپنا وقت سوڈوکو کے خالی خانوں کو بھرنے ،کرکٹ کے چوکے چھکے دیکھنے میں گزار دیتا ہے اور اپنی فیملی میں ماں ،بیوی ،بچوں سے بات کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا یا ہٹلر کی طرح جارحانہ رخ اختیار کرتا ہے۔یقیناً اس کے غیر اخلاقی کردار کو اچھا بالکل نہیں کہا جا سکتا۔اس طرح کے برے عمل کو اسی وقت فروغ حاصل ہوتا ہے جب اسے نظر انداز کیا جاتا ہے، یا اس پر سوال نہیں کیے جاتے ،یا عورت خود کو تبدیل نہیں کرتی ،خود کو بدلنے سے فوری طور پر مشکل مرحلے سے باہر نکلا جا سکتا ہے لیکن یہ کوئی دائمی حل نہیں ہے ۔مزاحمت کرنا بہت ضروری ہے ۔ہو سکتا ہے سوال کرنے پر بھی تبدیلی نہ آئے ۔ہو سکتا ہے دبی ہوئی خاموشی اچانک دھماکے کے ساتھ باہر آئے ،لیکن اس سے بہتر ہے کہ خوش گوار ماحول کے ذریعے سطح پر لانے کی ایمان داری سے کوشش دونوں جانب سے کی جائے۔

ایک چھوٹی سی مثال ان دو کام گاروں کی ہے جس میں ایک ڈانٹ برداشت کرتا نہیں فوراً جواب دے دیتا ہے ۔مالک اس کے منھ لگنا نہیں چاہتا۔دوسرا وہ جو جواب نہیں دیتا خاموشی سے ڈانٹ سنتا رہتا ہے ۔مالک ہر چھوٹی بڑی غلطی پر اسے آرام سے برا بھلا کہتا ہے ۔کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ یہی وہ مہرا ہے جسے آسانی کے ساتھ ٹھوکر ماری جا سکتی ہے۔

ایک واقعے کا ذکر کرنا یہاں غیر مناسب نہ ہوگا۔میری ایک دوست کی بیٹی شادی کے بعد امریکہ چلی گئی ۔دوسرے ممالک میں ہندوستان کی طرح گھر کا کام کرنے کے لیے نوکرانی آسانی سے نہیں ملتی ۔یہ لڑکی شادی سے پہلے اچھی خاصی نوکری کرتی تھی ۔شادی کے دو سال بعد بچہ ہونے پر گھر کے سارے کام کرنے کے ساتھ بچے کی دیکھ ریکھ بھی کرنی ہوتی ۔شادی کے چار سال بعد کوئی چھوٹا سا کام نہ پورا ہونے پر اسے ہمیشہ یہی سننا پڑتا تھا کہ سارا دن تم کیا کرتی ہو، یہ کارپٹ پر چاول کا ایک دانہ کیوں پڑا ہے۔واش بیسن کے پاس تولیا کیوں نہیں ہے۔شرٹ ٹھیک سے پریس کیوں نہیں کی ۔آخر سارا دن گھر میں کرتی کیا رہتی ہو۔چار سال تک روز اس قسم کے طعنے ملتے رہے،تم سارا دن کرتی کیا ہو؟ اگلے دن جب شوہر کام سے واپس آیا تو دیکھا کہ بستر تہہ

نہیں ہے۔ کپڑے مشین میں دھونے کے لیے ڈالے نہیں گئے تھے۔کھانا تیار نہیں تھا۔دھلے ہوئے کپڑے آئرن بورڈ پر ویسے ہی پڑے تھے۔برتنوں کا ڈھیر واش بیسن میں پڑا تھا۔شوہر نے گرجتے ہوئے کہا۔''یہ کیا تماشہ ہے گھر کا یہ حال کیا بنا رکھا ہے''؟بیوی نے کہا'' آج میں نے سچ میں کچھ نہیں کیا ہے۔یہی سارے کام میں چار سال سے روز کرتی آرہی ہوں،وہ آپ کو دکھائی نہیں دے رہے تھے''۔یہ احساس شوہر کو بالکل نہیں ہوتا کہ امور خانہ داری کے کتنے سارے کام جو دن کا ایک بڑا حصہ لے لیتے ہیں۔

ایک شادی شدہ خوش حال زندگی،ہم آہنگی اور اتفاق و اتحاد کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔جس میں میاں اور بیوی کی حصہ داری برابر کی ہونی چاہیے۔اگر ایسا نہیں ہے تو اسے بات چیت کے ذریعے یا کھلے ذہن سے ہر پہلو پر غور وفکر کرنی چاہیے،ورنہ جن بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے ایک عورت پوری زندگی صرف کر دیتی ہے اس کا سب سے بڑا خمیازہ بچوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔وہ ڈپریشن سے لے کر خودکشی کے علاوہ ڈرگس کے عادی ہو جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاشی طور پر خودکفیل ہونے سے تشدد میں کوئی کمی آجاتی ہے۔لیکن اس سے زندگی میں اہم فیصلے لینے اور زندگی گزارنے کے متبادل ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں۔بہت سے مفروضات اس معاشی آزادی کے چلتے تبدیل ہو جاتے ہیں۔معاشی طور پر خود کفیل ہونے سے متوسط گھر کی عورت کو فائدہ ضرور دیتا ہے کہ عدم مساوات کے جو حالات پیدا ہوتے ہیں اس سے نکلنا تھوڑا آسان ہو جاتا ہے۔جو کہ پوری طرح شوہر کی کمائی پر منحصر عورت کے لیے ممکن نہیں۔جہاں ایک طرف دوسروں پر منحصر عورت مشکلات سے نہیں نکل پاتی اور خود کو سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔وہیں دوسری جانب معاشی طور سے خودکفیل عورت شوہر کے حربے کو آسانی سے نمٹ لیتی ہے وہ اپنی زندگی کو ازسر نو ترتیب دے سکتی ہے۔ذہنی غلامی سے باہر آنا اس کے لیے کافی آسان ہوتا ہے۔اس کے سامنے بہت سے متبادل کھلے ہوتے ہیں۔اس لیے معاشی طور پر خودکفیل ہونا عورت کی آزادی کی پہلی شرط ہے۔ساتھ ہی عورت اپنے ''ہونے'' اور اپنے ''جینے'' کو اولیت دے،شوہر اور بچوں کی ذمہ داری کو بخوبی نبھاتے ہوئے اسے اپنے لیے بھی تھوڑی سی جگہ رکھنی چاہیے۔

عام طور پر باہری دنیا سے بے گانہ عورتیں اپنا ایک ایک پل گھر کے لیے قربان کر دیتی ہیں۔اور اپنے خوش ہونے اور دکھی ہونے کی وجہ شوہر میں تلاش کرتی ہیں۔اپنے وجود کو مطمئن کرنے کے لیے وہ اس طرف دیکھتی ہیں جہاں ان کے جذبات کچل دیے جاتے ہیں۔وہ ہر وقت شوہر کی مزاج پرسی کے لیے تیار رہتی ہیں۔اگر وہ خود سے بات کرلے اور ناراض نہ ہو تو بیوی خود کو کسی رانی سے کم نہیں سمجھتی۔اور جس دن وہ ناراض ہوکر، منھ پھلا کر گھر سے نکل جاتا ہے تو اس کی بیوی پورا دن شوہر کو خوش کرنے کے حربے تلاش کرتی رہتی ہے۔ہندوستانی معاشرے کی کتنی بری بدحالی ہے کہ بیوی خوش ہونے اور دکھی ہونے کے لیے شوہر کے موڈ پر منحصر ہوتی ہے۔اس کی خوشی کی مقدار شوہر کا موڈ طے کرتا ہے۔

جس دن ایک عورت کو یہ سمجھ آجائے گا کہ اس کی اپنی زندگی اور اپنے موڈ کی بھی کوئی اہمیت ہے اور اس سے کھیلنے کا حق اس کو تو بالکل نہیں ہے، جو اس سے محبت تو نہیں کرتا لیکن پورا پورا کنٹرول چاہتا ہے۔اس سمجھ کے بعد حالات پیچیدگی سے آسانی کی طرف خود بہ خود رجوع کرنے لگیں گے۔وہ جس دن شوہر سے زیادہ خود کی بات سمجھنے لگے گی اور اپنے دائرے کا انتخاب آزادانہ طور پر کرلے گی، جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ معاشی طور پر خود کفیل ہوکر، اپنے دل و دماغ پر شوہر کو نہیں حاوی ہونے دے گی اسی دن سے وہ خوش حال زندگی بسر کرنے لگے گی۔

عورتوں کی کئی نسلوں نے قوت برداشت کو اپنا سب سے خوبصورت گہنا تسلیم کیا اور اس کے بوتے پر ہندوستان کی کروڑوں شادیاں بچی رہ گئیں۔ایک دلچسپ واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔خواتین تنظیم کے مرکز پر ایک ورکشاپ کے بعد ایک گاؤں کی عورت نے پریشان کن انداز میں پوچھا، ایک سال پہلے میری بیٹی کی شادی ہوئی۔اسی وقت سے اس کے سسرال والے بہت پریشان کررہے ہیں۔اسے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں دیتے۔وہ سوکھ کر کانٹا ہورہی ہے۔میں جاتی ہوں تو مجھے بات نہیں کرنے دیتے۔کیا کروں؟ ایک عمر رسیدہ کارکن نے انھیں مشورہ دیا۔کہ اگر آپ رات کو دہی جمنے کے لیے رکھتی ہیں تو کیا آپ ساری رات اس میں انگلی ڈال کر دیکھتی رہتی ہیں کہ دہی جمی ہے یا نہیں؟ نہیں نا؟ دہی کی جمنے میں ایک رات چاہیے۔اسی طرح نئے ماحول میں نئی لڑکی کو اپنی طرح سے تال میل بٹھا کر جمنے دیں۔وہ اپنے آس پاس کے ماحول میں رہنا سیکھ

جائے گی۔ زیادہ تر ماں باپ بھی یہی کرتے ہیں۔ وہ بار بار روتی بلکتی بیٹی کو ایڈجیسٹ کرنے کی سیکھ دے کر پھر سے اسی ماحول میں بھیج دیتے ہیں۔ اور ایک دن اسٹو پھٹنے سے اس کی موت کی خبر پا کر پولس تھانے کورٹ کچہری کے چکر کاٹتے ہیں۔ جس کا کبھی کوئی حل نہیں نکلتا۔ 2011 میں بھی ممبئ شہر میں ہوئی سی۔اے۔اور ایم۔بی۔اے کرنے والی تعلیم یافتہ لڑکیاں محبت کی شادی کے بعد ساری پریشانی کا حل خودکشی میں تلاش کرتی ہیں۔

پچھلی نسلوں کی سب سے بڑی غلطی یہ رہی کہ جہاں شادی ہوئی لڑکی سے تعلق ختم۔ بیٹیاں کیسے بھی کر کے پوری زندگی کاٹ دیتی تھیں۔ کیوں کہ اسے یہ معلوم تھا کہ والدین کسی بھی طرح اس سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ جس دہلیز کو وہ چھوڑ کر چلی آئی ہے ضرورت پڑنے پر بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا نہیں ملے گا۔ اس لیے وہ کبھی اپنے دکھ اپنے والدین بھائی بہن سے نہیں شیئر کرتی۔ والدین کی اہمیت بیٹی کی شادی کے بعد اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ جو اسے غیر ضروری تال میل بنا کر رکنے پر مجبور نہ کرے۔

ہماری نسل کی عورتیں آج کی نوجوان نسل کی لڑکیوں کے لیے زیادہ فکر مند ہوتیں ہیں۔ کہ موجودہ عہد میں طلاق کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ کیا اس طرح سے شادی کے وجود کو خطرہ نہیں ہے؟ دراصل ہماری نسل بہت ڈری ہوئی ہے کیوں کہ ان کی یہی سوچ ہے کہ طلاق کے بعد لڑکی کو نیچی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور پدرسری نظام میں اکیلے رہنا آسان نہیں ہے۔ اکیلی لڑکی کو کرائے کا گھر نہیں ملتا۔ اکیلی عورت کو ہر مرد بری نظر سے دیکھتا ہے۔ مانوں کہ دستیاب ہونے کا تمغہ لیے پھر رہی ہے۔ اس لیے پچھلی نسلوں کی عورتیں سوچتی ہیں کہ بھوکے بھیڑیوں کی جماعت میں اپنی عزت محفوظ رکھنا مشکل ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم ایک ہی مرد کی زیادتیاں برداشت کر لیں لیکن شادی کا پاک تعلق برقرار رہے۔ دراصل ہم یہ سوچ ہی نہیں پاتے کہ برابری اور خوش گوار ماحول میں شادی قائم و دائم رہ سکتی ہے جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کی قدر کرتے ہوں۔ محبت سمجھداری برابری اور عزت دار ماحول زندگی کو کتنا آسان بنا سکتا ہے یہ ہماری سوچ سے باہر ہے۔ ہم ایسے رشتے کو پیار کا نام دے سکتے ہیں جہاں ایک فریق حکومت کرتا ہے اور دوسرا فریق محکوم ہوتا ہے۔ کسی کی زیر نگرانی رہنے سے ڈر اور خوف ہمیشہ بنا رہتا ہے۔ ایسے میں اگر نئی نسل کی لڑکیاں اپنی پوری زندگی کسی کی غلام رہے بغیر ایک آزاد راستہ منتخب کرتی ہیں تو طلاق کی جانب ان

کے بڑھتے قدم سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔مساواتی پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے اس چاہت کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

بیوی کی شخصیت کو پامال کرنے کے کچھ طریقے

بیوی کو اس کے دوستوں اور رشتے داروں اور امدادی گروہ سے کاٹ دینا۔

بیوی کو معاشی طور پر خود کفیل ہونے سے روکنا۔

بیوی سے حسد کرنا اور اس پر حق جتانا۔

بیوی پر حق دکھا کر محبت کا دکھاوا کرنا۔

اس پر سیکس کے لیے زور دینا۔

سب کے سامنے برابر تنقید کرنا۔

اسے دھمکانہ تشدد کرنا اور سزا دینا۔

اس پر کنٹرول کرنے کے لیے بچوں کا سہارا لینا۔

سارے ضروری فیصلے خود لینا،اہم موضوعات پر اس کی رائے نہ لینا۔

پیسے پر کنٹرول رکھنا، گھریلو خرچ کے لیے پیسے نہ دینا۔

اس پر دوسرے مردوں سے تعلق رکھنے کا الزام لگانا۔

اس پر ہم جنس پرستی کا الزام لگانا۔

یہ مضامین اپنی مختصر شکل میں انگریزی اخبار ''دا ہندو'' 30 مارچ 2008 کے میگزین سیکشن میں ''داوائلنس آف سائلنس'' اور ''انڈر دا کلاوَڈ آف ابیوز'' عنوان سے اور مراٹھی، ہفتہ وار ''سکال'' 10 مئی 2008 میں ''موک ہنسا'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

• • •

کہانی

رہو گی تم وہی

ایک

''کیا یہ ضروری ہے کتنی بار گھنٹی بجنے سے پہلے دروازہ کھولا ہی نہ جائے؟ایسا بھی کون سا پہاڑ کاٹ رہی ہوتی ہو۔آدمی تھکا ماندہ آفس سے آئے اور پانچ منٹ دروازے پر ہی کھڑا رہے''۔

''اسے گھر کہتے ہیں؟ یہاں کپڑوں کا ڈھیر،وہاں کھلونوں کا ڈھیر اس گھر میں کوئی چیز سلیقے سے نہیں رکھی جاسکتی؟''

''اُف اس بستر پر تو بیٹھنا مشکل ہے،چادر سے پیشاب کی گندھ آرہی ہے۔یہاں وہاں پوتڑے سکھاتی رہو گی تو گندھ تو آئے گی ہی،کبھی گدّے کو دھوپ میں سکھالیا کرو،پر تمہاری تو بارہ مہینے ناک ہی بند رہتی ہے،تمھیں کوئی خوشبو اور بدبو نہیں آتی''۔

''اچھا تم سارا دن یہی کرتی ہو کیا؟ جب دیکھو چمٹی بیٹھی ہو بچوں میں۔میری ماں نے سات بچے پالے تھے پھر بھی گھر صاف ستھرا رہتا تھا۔تم نے دو بچوں میں ہی گھر کو برا کر رکھا ہے جیسے گھر میں کرکٹ کی پوری ٹیم پل رہی ہے''۔

''پھر وہی شربت تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔میرا گلا خراب ہے۔پکڑا دیا ہاتھ میں ٹھنڈا شربت۔کبھی عقل کا کام کیا کرو۔جاؤ چائے لے کر آؤ اور سنو آگے سے آتے ہی ٹھنڈا شربت مت لے آیا کرو سامنے۔بیمار پڑنا برداشت نہیں کرسکتا میں۔آفس میں دم لینے کی فرصت نہیں رہتی مجھے۔ پر تمھیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔تمھیں تو اپنی طرح ساری دنیا سلو موشن میں چلتی دکھائی دیتی ہے۔

''سارا دن گھر گھسری بنی کیوں بیٹھی رہتی ہو! کھلی ہوا میں تھوڑا باہر نکلا کرو۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔ بال سنوارنے کا بھی وقت نہیں ملتا تمھیں تو بال چھوٹے کروالو، شکل بھی کچھ بھلی ہو جائے گی۔ پاس پڑوس کی سمجھدار عورتوں میں بیٹھا کر۔''

''باؤ جی کو کھانا دیا؟ کتنی بار کہا ہے، انھیں دیر سے کھانا ہضم نہیں ہوتا، انھیں وقت پر کھانا دے دیا کرو۔ دے دیا ہے؟ تو منھ سے بولو تو صحیح۔ جب تک بولو گی نہیں، مجھے کیسے سمجھ آئے گا؟''

اچھا سنو، وہ کتاب کہاں رکھی ہے تم نے؟ ٹیبل کے اوپر، نیچے سب جگہ ڈھونڈ لیا، شیلف بھی چھان مارا۔ تم سے کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں رکھی جاتی؟ غلطی کی جو تم سے پڑھنے کو کہہ دیا۔ اب وہ کتاب اس زندگی میں تو ملنے سے رہی۔ تم عورتوں کے ساتھ یہی دقت ہے۔ شادی ہوئی نہیں بال بچے ہوئے نہیں کہ کتابوں کی دنیا کو الوداع کہہ دیا اور لگ گئی نون تیل لکڑی کے جنجال میں۔ پڑھنا لکھنا گیا بھاڑ میں۔''

یہ کوئی کھانا ہے۔ روز وہی دال روٹی بینگن بھنڈی، آلو۔ آلو کے بغیر کوئی سبزی ہوتی ہے اس ہندوستان میں یا نہیں؟ گوبھی میں آلو میتھی میں آلو، ہر چیز میں آلو۔ تم سے ڈھنگ کا کھانا بھی نہیں بنایا جاتا۔ اب اور کچھ نہیں کرتی ہو تو کم سے کم کھانا تو سلیقے سے بنایا کرو!۔ جاؤ ایک مہینا اپنی ماں کے پاس رہ آؤ، ان سے کچھ ریسپیز نوٹ کر کے لے آنا۔ ماں تو تمہاری اتنا بہترین کھانا بناتی ہیں، تمھیں کچھ نہیں سکھایا؟ کبھی چائنیز بناؤ، کنٹی نینٹل بناؤ کھانے میں ورائٹی تو ہو۔''

''وہ کتاب ضرور ڈھونڈ کر رکھنا، مجھے واپس دینی ہے۔ یہ مت کہنا بھول گئی۔ تمھیں آج کل کچھ یاد نہیں رہتا۔''

اب تو دونوں سو گئے ہیں، اب تو یہاں آجاؤ۔ بس میرے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اور سنو۔ باؤ جی کو دوائی دے کر آنا نہیں تو ابھی آواز لگائیں گے......''

''آؤ بیٹھ جاؤ میرے پاس! اچھا یہ بتاؤ، میں نے اتنے ڈھیر سارے پرپوزل میں تمھیں شادی کے لیے کیوں چنا؟ اس لیے کہ تم پڑھی لکھی تھی، موسیقی پر مہارت تھی۔ غزلوں میں تمہاری دلچسپی تھی، اتنے خوبصورت لینڈ اسکیپ تمہارے گھر کی دیواروں پر لگے تھے۔ تم نے اپنا یہ حال کیسا بنالیا؟ چار کتابیں لا کر دیں تمھیں، ایک بھی تم نے کھول کر نہیں دیکھی۔ ایسی بیویوں کے

شوہر پھر دوسری کھلے دماغ والی عورتوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور تمہاری جیسی بیویاں گھر میں بیٹھ کر آنسو بہاتیں ہیں؟ پر اپنے کو صحیح کرنے کی کوشش بالکل نہیں کریں گی۔''

تمہارے کپڑوں میں سے بھی بے بی پھوڑ اور تیل مسالوں کی بدبو آرہی ہیں۔سونے سے پہلے ایک بار نہالیا کرو، تمھیں بھی صاف ستھرا لگے اور......''

یہ لو میں بول رہا ہوں اور تم سو بھی گئی۔ابھی تو ساڑھے دس بجے ہیں، یہ کوئی سونے کا وقت ہے؟صرف گھر کے کام کاج میں اتنا تھک جاتی ہو کسی اور کام کے لائق بھی نہیں رہتیں......''

دو

تمہاری عادتیں کبھی صحیح نہیں ہوں گی۔پندرہ سال ہو گئے ہماری شادی کو، پر تم نے ایک چھوٹی سی بات نہیں سیکھی کہ آدمی تھکا ہوا آفس سے گھر آئے تو ایک بار کی گھنٹی میں دروازہ کھول دیا جائے۔تم اس کونے والے کمرے میں بیٹھی ہی کیوں رہتی ہو کہ یہاں تک آنے میں اتنا وقت لگے؟ میرے آفس سے واپس آنے کے وقت تم، یہاں اس سوفے پر کیوں نہیں بیٹھتی؟۔''

اب یہ گھر ہے؟ نہ میز پر ٹرے، نہ باتھ روم میں تولیا۔بس جہاں دیکھو کتابیں، کتابیں میز پر، شیلف پر، بستر پر، کارپیٹ پر، باورچی کھانے میں، باتھ روم میں، کیا اب کتابیں ہی اوڑھے بچھائیں، کتابیں پہنیں، کتابیں کھائیں؟......

یہ کوئی وقت ہے چائے پینے کا؟ کھانا لگاؤ۔گرمی سے ویسے ہی بے حال ہیں، آتے ہی چائے دے دی، کبھی ٹھنڈا لیموں پانی ہی لایا کرو۔''

''اچھا اتنے اخبار کیوں دکھائی دیتے ہیں یہاں؟ شہر میں جتنے اخبار نکلتے ہیں سب تمھیں ہی پڑھنے ہوتے ہیں؟ خبریں تو ایک ہی ہوتی ہیں سب میں، پڑھنے کا بھوت سوار ہو گیا ہے تمھیں۔کچھ ہوش نہیں کہ گھر کہاں جا رہا ہے، بچے کہاں جا رہے ہیں'' ......

''یہ کیا کھانا ہے؟ بور ہو گئے ہیں روز روز سوپ پی۔پی کر اور یہ فلانہ ڈھمکانہ بے کڈ اور بائلڈ ویزی ٹیبل کھا، کھا کر۔گھر میں روز ہوٹلوں جیسا کھانا نہیں کھایا جاتا۔اتنا نیوٹریشن کانشن ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔کبھی سادی دال روٹی بنا دیا کرو، لگے تو کہ گھر میں کھانا کھا رہے ہیں۔آج کل کی عورتیں غیر ملکی نقل میں ہندوستانی مصالحوں کا استعمال بھی بھولتی جا رہی ہیں۔''

''یہ کیا ہے، میرے جوتے مرمت نہیں کروائے تم نے؟ اور بجلی کا بل بھی نہیں بھرا؟ تم سے گھر میں ٹک کر بیٹھا جائے پھرنا! اسکول میں پڑھاتی ہو، وہ کیا کافی نہیں ہے؟ اوپر سے یہ سماجی فلاحی کاموں کا روگ بھی پال لیا اپنے سر پر۔ کیوں جاتی ہو اس فٹیچر سماجی فلاحی دفتر میں؟ سب پپو کریٹ عورتیں ہیں وہاں۔ ملتا کیا ہے تمھیں؟ نہ پیسہ، نہ دھیلا! اوپر اپنے آنے اور جانے کا کرایہ بھی پھونکتی ہو۔''

''یہ ہے تمہارے لاڈلے کا رپورٹ کارڈ! فیل نہیں ہوں گے تو اور کیا! ماں کو تو فرصت ہی نہیں بیٹے کے لیے۔ اب مجھ سے امید مت کرو کہ میں تھکا ہوا آفس سے آکر دونوں کو حساب پڑھانے لگوں۔ ایم۔اے کی گول میڈلسٹ ہو، تم سے اپنے ہی بچوں کو پڑھایا نہیں جاتا؟ تمھیں ان کی میتھ نہیں آتی تو ایک ٹیوٹر رکھ لو۔ اب تو تم بھی کماتی ہو، اپنا پیسہ سوشل کاموں میں اڑانے سے بہتر ہی ہے کہ بچوں کو کسی لائق بناؤ۔ سارا دن ایم۔ٹی۔وی، دیکھتے رہتے ہیں۔''

''یہ تم نے بال اتنے چھوٹے کیوں کرا لیے ہیں؟ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ تمھیں کیا لگتا ہے، چھوٹے بالوں میں بہت خوبصورت دکھتی ہو؟ یہ لُک ہاری بل! تمہاری عمر میں زیادہ نہیں تو دس سال اور جڑ جاتے ہیں۔ چہرے پر سوٹ کرے یا نہ کرے، فیشن ضرور کرو۔''

''سونا نہیں ہے کیا؟ بارہ بج رہے ہیں۔ بہت پڑھاکو بن رہی ہو آج کل۔ تمھیں سونا نہیں ہے تو دوسرے کمرے میں جا کر پڑھو۔ مہربانی کر کے اس کمرے کی لائٹ آف کر دو اور مجھے سونے دو۔''

''اب ہاتھ سے کتاب چھوڑو تو سہی! سچ کہہ رہا ہوں مجھے غصہ آ گیا تو اس کمرے کی ایک ایک کتاب اس کھڑکی کے نیچے پھینک دوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں کیسے......''

''ارے کمال ہے۔ میں بول رہا ہوں، تم سن نہیں رہی ہو۔ ایسا بھی کیا پڑھ رہی ہو، جسے پڑھے بنا تمہارا جنم ادھورا رہ جائے گا۔ کتنی بھی کتابیں پڑھ لو، تمہاری عقل میں کوئی دانائی نہیں فروغ پا سکتی۔ رہو گی تم وہی......''

• • •

یہ مخفی ظلم کی کہانی ہے

’’جس کے نشان نہیں دکھتے‘‘مضمون میں ذہنی تشدد سے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں۔اسے صرف شوہر کی انارکیوں سے نہیں وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ہندوستانی متوسط گھرانوں میں بیٹوں کے ہراچھے برے عمل کی واہ واہی کی جاتی ہے جب کہ لڑکیوں کے اچھے عمل کو بھی نظرانداز کیا جاتا ہے۔انھیں اپنے اچھے کام کی مثبت تائید ملنا تو دور کی بات ہے بلکہ اس کے ہر عمل میں نقص کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ایک لڑکی کو پیدا ہوتے ہی ادب تہذیب کی ساری تعلیم سے مزین کیا جاتا ہے۔اسے بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ لڑکی ہے۔اور کہیں نہ کہیں یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ ایک لڑکی کبھی لڑکوں کی برابری نہیں کرسکتی۔اس کے لیے وہ سارے دروازے بند ہیں جو ایک لڑکے کے لیے کھلے ہیں۔

سرسری طور پر دیکھنے سے یہ کہانی طنزومزاح کا پیش خیمہ ہے۔ایک شوہر کے روزمرہ کے طنزیہ مکالمات کی کہانی کہی جاسکتی ہے۔لیکن ایک عورت پر اس کے کیا برے اثرات مرتب ہوں گے؟اس پر بھی غوروفکر کرنا چاہیے۔موجودہ دور کی سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ اگر گھر کے کسی فرد کو مسلسل طعن وتشنیع کا شکار بنایا جاتا رہے،تو وہ اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھودیتا ہے۔

اگر مجھے اپنی اب تک لکھی چار دہائیوں میں لکھی کہانیوں میں ایک بہترین کہانی کاانتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں اپنی اس کہانی ’’رہوگی تم وہی‘‘ بنا سوچے سمجھے منتخب کرلوں گی۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔کئی مرتبہ مصنف کے دماغی خلل کی وجہ سے اس کا قلم سرد پڑ جاتا ہے۔یہ خلل کبھی نہ کبھی مصنف کی زندگی میں ضرور آتا ہے۔لیکن میرے ساتھ کچھ زیادہ ہو گیا۔1980 کے بعد تقریباً بارہ تیرہ سال کی خاموشی کے بعد 1993 میں ایک کہانی لکھی’’رہوگی تم

وہی''۔بارہ سال کی خاموشی کسی بھی مصنف یا مصنفہ کی خوداعتمادی کو مجروح کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے ۔وہ خاموشی کھل کر آ گئی ہے ۔یہ کہانی ایک طویل وقت تک میرے ذہن میں رہی ۔لیکن یہ معمولی سی دکھنے والی کہانی کی تفہیم کے لیے مجھے فارمیٹ نہیں مل رہا تھا۔اور اسے روایتی انداز میں لکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔واحد متکلم طرز ادا میں لکھی گئی کہانی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کہانی تو نہیں کچھ اور ہے۔بہر حال یہ کچھ بھی ہے، میرے خیال کے مطابق اپنی بات کی ترسیل کے لیے یہ فارمیٹ سب سے کارآمد ہے۔

کہانی لکھنے کے بعد ایک چھوٹی میگزین کے مدیر کے پاس بھیجی ۔جنھوں نے کہانی پڑھنے کے بعد کڑھتے ہوئے کہا۔''کیا عورتیں بولتی ہی نہیں ہیں'' یہ تو ایک پہلو پر لکھی گئی ہے'' پھر طنزیہ لہجے میں کہا''ایک کہانی ایسی بھی تحریر کریں جہاں عورتیں بولتی ہوں اور مرد خاموش رہتے ہوں''۔میں نے ان سے گزارش کی۔''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔اسے واپس بھیج دیں۔میں آپ کو دوسری بھیجتی ہوں''۔

پھر میں نے اس کہانی کو''ہنس'' کے مدیر راجندر کے پاس بھیجی۔کہانی پڑھتے ہی انھوں نے منظوری دے دی۔اور جون 1994 کے شمارہ، میں یہ کہانی شائع ہوئی۔کہانی شائع ہوتے ہی اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔آن لائن ہوتے ہی دوسرے ممالک کی زبانوں میں نکڑ ناٹک کے طور پر اس کا پلے ہوا۔اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ صرف ہندوستانی معاشرے کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ بین الاقوامی مدعا ہے۔لندن کے ایک ایکسپریمنٹ گروپ نے اسے پلے کیا۔اداکار سعید جعفری نے لندن کے نہرو سینٹر میں اس کہانی کا ڈرامائی مکالمہ پڑھا۔ڈاکٹر''داغ مارکوا'' نے اسے ڈرامے کے طور پر چیک زبان میں ترجمہ کیا۔تورین،اٹلی کی اَلا ساندے نے انٹرنیت سے نکال کر اطالوی زبان میں پلے کیا۔ممبئی کی چوپال میں اداکار راجندر گپتا نے کئی مرتبہ اسے اپنے خاص انداز میں سنایا۔

اس کہانی کو مردوں نے خوب سراہا اور جب بھی اس کہانی کا نکڑ ناٹک کیا گیا اور ڈائیز پر اسے پڑھا گیا۔کئی مردوں کا یہ برملا اظہار تھا کہ یہ کہانی ہمیں آئینہ دکھاتی ہے۔لیکن کچھ شدید تنقید بھی کی گئی کہ کیا ہمیشہ بولنے والا مرد ہی ہوتا ہے؟ کیا عورتیں بولتی ہی نہیں؟ یہ ایک طرفہ کہانی ہے۔ دراصل یہ کہانی مرد کے مسلسل بولنے اور عورت کے خاموش رہنے کی کہانی ہے بھی

نہیں۔اس میں ہر مکالمے کے بیچ ''ریڈنگ بٹ وین دا لائنس'' کی کافی گنجائش ہے۔یہ کہانی عورت کو بدلنے کی اور مرد کے مزاج کو نقل کرتی کہانی ہے۔عنوان ''رہوگی تم وہی'' کے بعد خواتین تو بدل رہی ہیں لیکن مرد اپنی پرانی روش پر قائم ہے۔ضرورت تو اس کے تبدیل ہونے کی ہے۔وہ کب بدلے گا؟ یہ سوال باعث تشویش ہے۔

ایک نوجوان شاعرہ نیل مادوبے کی نظم:-

میں گھر میں رہتی ہوں
تو وہ کہتے ہیں
کسی کام کی نہیں ہے،
کچھ نہیں کرتی،

سست ہے،
بیٹھ کر کھانے میں
شرم نہیں آتی اسے
اب میں کمانے لگی ہوں
باہر آتی جاتی ہوں
تو وہ کہتے ہیں
بے شرم بے حیا ہے،
وقت کا احساس نہیں رہتا اسے،
گھر سے مطلب کہاں ہے
اب یہ اڑنے لگی ہے،
اس کے پر کترنے پڑیں گے۔

● ● ●

کہانی

بولنے کا حق

''آ گئے ؟ یہ لو خالی ہاتھ ہلاتے چلے آئے ، میں نے کچھ لانے کو کہا تھا ؟ یا د نہیں رہا۔کوئی نئی بات ہے؟یادرہتا کب ہے؟اب میں باہر بھی کام کروں اور گھر کا سارا جنجال بھی سنبھالوں ۔مرنے دو، مجھے کیا پڑی ہے۔میں بھی نہیں جاتی۔ چلنے دو، گھر جیسے چلتا ہے''۔

''چپلیں اندر کہاں لیے جا رہے ہو؟ ساری دنیا کی دھول مٹی کمرے میں پھیلا دی۔ چپلیں دروازے پر اتاری نہیں جاتی ؟ پیروں میں مٹی لگی رہے، تمھیں کیا آج کام والی بھی نہیں آئی ہے پر تمھیں کیا فرق پڑتا ہے۔گھر گندہ رہے،صاف رہے تمہاری بلا سے۔ ہر کام کے لیے میں ہی مرتی کھپتی رہوں۔''

''ان اُکھڑی ہوئی چپلوں کو پہننا بہت اچھا لگتا ہے کیا؟ دس دن سے دیکھ رہی ہوں، پیر گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہے ہو۔دو منٹ موچی کے پاس کھڑے ہو کر سلوا بھی نہیں سکتے ؟ سارا دن کافی ہاؤس میں پڑے سگریٹ پھونک پھونک کر شیخی بگھارتے رہتے ہو۔کافی ہاؤس کے باہر ہی تو موچی بیٹھا رہتا ہے، پر نہیں، کیوں سلواؤ چپل! پھٹی ٹوٹی چپل پہننے میں جو شان ہے، وہ درست چپل پہننے میں کہاں۔''

''بیٹا بھی وہی رنگ ڈھنگ سیکھ رہا ہے۔کپڑے دھلائی میں ڈالتا نہیں ۔مہینے بھر سے ایک جینس اور ہوائی چپل پہنے گھوم رہا ہے۔شیو بھی نہیں کرتا ۔میلے کپڑے لادے رہنے میں ہی شان سمجھتا ہے۔باپ پر بیٹا۔آخر بیٹا کس کا ہے ایک میں ہی ہوں جسے عزت کا پاس ولحاظ ہے۔وہ دو چار سوتی ساڑیاں ،دھو سکھا کر پہنتی ہوں، اس پر بھی دونوں باپ بیٹے آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہتے ہو۔جیسے بڑا سج سنور کر نکل رہی ہوں ۔میں بھی تم دونوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ باندھے پھٹے

حال پڑی رہوں تو جو چار پیسے گھر آتے ہیں، اس کے بھی لالے پڑ جائیں۔ پر تمھیں کیا۔ تمھیں تو بیٹھے بٹھائے روٹیاں......''

''واہ تھالی سر کا کر اٹھ گئے؟ اس عمر میں بھی نخرے دکھانے باقی رہ گئے ہیں؟ پکاؤں بھی میں اور لاؤں بھی میں؟ تم سے تو بازار سے ایک سبزی نہیں لائی جاتی۔ تھیلا ہاتھ میں لیے ہوئے شرم آتی ہے۔ جب کھانا کھانے میں کسی کو شرم نہیں آتی لانے میں کیسی شرم! دو ایک بار خود خرید کر لاؤ تو پتا بھی چلے کہ ساگ سبزی کے دام کہاں جا رہے ہیں۔ اب خالص میری کمائی سے گھر میں چھتیس پکوان بننے سے رہے۔ خدا کا شکر ہے گھر میں دو وقت کی روٹی میسر ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑتے ورنہ تم نے تو اس کے لیے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''اچھا یہ بتاؤ میری ساڑی کام والی کو کس نے دی؟ میں ہفتہ بھر باہر کیا گئی، تم نے بڑی دریا دلی سے گھر کا سامان جہاں تہاں لٹا ڈالا! پانی بھرنے والا گھاٹی تمہاری ٹی شرٹ پہن رہا ہے، باہر ڈولتا پاگل بابا تمہارا کرتا پائجامہ لٹکائے گھوم رہا ہے، اپنے تو اپنے میرے بھی کپڑے بانٹ دیے! خود پھٹے چیتھڑے پہنو اور کپڑے مظلوم، بے کسوں میں بانٹتے پھرو۔ پورے محلے میں تم ہی دانی رہ گئے ہو۔''

''بس گھس گئے اپنے ڈبے میں! ایک تم اور ایک تمہاری بابا آدم کی زمانے کی میز، جس پر کہنے کو دو درجن پین رکھی ہیں پر کبھی حساب کرنے کو ہاتھ میں لو تو ایک بھی چلتا نہیں۔ سب کی سیاہی سوکھی پڑی ہے۔ اس گھر میں سوکھا ہر جگہ پھیل گیا ہے۔''

''لو پڑ گئے کتابوں میں سر ڈال کے! سچ کو برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، پر جس پر گزرتی ہے، سچ اسی کے منھ سے نکلتا ہے۔ تمھیں تو سچ سننے کی قوت ہی نہیں رہی کبھی۔ اور بڑا سچ لکھنے کا دم بھرتے ہو۔ بڑی تیکھی سچائیاں پیش کرتے ہو اپنے قلم سے۔ ہپوکریٹ ہو تم سب جتنا جھوٹ تم سب لکھنے والے ہو، شاید ہی اس دنیا کا کوئی آدمی اتنا جھوٹ بولتا ہو۔ اور خمار یہ کہ سچائی کا سہرا بھی اپنے ہی سر سجائے پھرتے ہو۔''

''دروازہ بند کر لینے سے میری آواز بند نہیں ہو جائے گی، یہ یاد رکھو۔ کمرہ بند کر کے لکھو پھول اور پتیوں کی نظمیں۔ کرو آسمان، سورج، چاند، ستاروں اور سمندر کی باتیں۔ خوب ہجو کرو سیاست

دانوں اور رشوت خوروں کی، لوٹو واہ واہی۔ گھر تو اپنا سنبھالا نہیں جاتا، دنیا جہان کی ہانکتے ہو۔ ارے بیٹے کو بٹھا کر کچھ پڑھایا ہوتا تو آج وہ بھی تمہاری طرح ناکارہ نہ گھومتا۔ اپنی دنیا ہی میں قید رہے زندگی بھر اور دو، دو زندگیاں برباد کیں۔ میں نے تو تمہارے ساتھ کیسے بھی گزارا کر لیا، پر اس کی بیوی اسے دو دن میں چھوڑ نہ گئی تو کہنا۔ پر تمھیں کیا! اپنے دربے میں بند ہو کر کاغذ کالے کرتے رہنا۔''

کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے۔ گھر میں ہم تین انسان اور چار کونے۔ سب ایک دوسرے سے کٹے ہوئے الگ، تھلگ۔ باپ بیٹے کے مزاج میں رائی کا فرق نہیں پر رشتے میں چھتیس کا ناتہ ہے۔ مجھے تو یاد ہی نہیں آتا کہ تم دونوں نے آپس میں بیٹھ کر کبھی صلاح مشورہ کیا ہو۔ کوئی بات کرنے بیٹھے نہیں کہ بحث شروع ہو جاتی ہے۔ ارے، بیٹا بڑا ہو جائے تو دوست سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ میری کتنی خواہش تھی کہ تم دونوں دوستوں کی طرح رہو! یہ بات کہو تو آگ لگ جاتی ہے تمھیں۔ کہتے ہو، میں نے ہی اسے تمہارے خلاف بھڑکایا ہے۔ اور سنو میں کیوں بھڑکاؤں گی بھلا! مجھے کیا پڑی ہے! اس کے کیا آنکھ کان نہیں ہیں؟ دیکھتا سمجھتا نہیں کہ گھر میں کیسے مہمانوں کی طرح رہتے ہو؟ گھر نہ ہوا ہوٹل ہو گیا ہے تمہارے لیے، بلکہ میں کہوں، جیسے وہ میرے ساتھ پیش آتا ہے، سب تم سے ہی سیکھا ہے اس نے، اور کیا! نہ تم نے مجھ سے کبھی پیار کے بول بولے نہ اس سے۔ وہ زمانہ گیا۔ جب ہتھیلی میں اس کا سر لے کر اسے لوریاں سنایا کرتے تھے۔ ہائے اس بچے کو وہی دو چار ماہ اٹھایا تم نے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد تمہاری نفرت ہی جھیلی اس نے۔ بیس سال کا ہونے والا ہے پر کبھی اس کے ہاتھ میں بیس روپے دیے ہو تم نے کہ لے بیٹا، پاؤ بھاجی کھا لینا......''

''پتا نہیں جو تھوڑا بہت کماتے ہو، جاتا کہاں ہے! مجھے تو پتا ہی نہیں کہ کتنا پیسہ ملتا ہے تمھیں! جیب تو ہمیشہ خالی ہی رہتی ہے۔''

یہ لو ایک اور لو لیٹر! اس عمر میں بھی تمہاری جیب سے لو لیٹر ہی نکلتے ہیں۔ بھوکے بھجن ہو نہ ہو، عشق بازی تو ہو ہی سکتی ہے۔ بیٹا شادی کی عمر پر آ رہا ہے اور عشق کا خمار باپ پر سوار ہے۔ پتا نہیں، یہ تم سے آدھی عمر کی لڑکیاں کیا دیکھتی ہیں تم میں! سب اول درجے کی احمق ہوتی ہیں۔ مرتی ہیں تمہاری خیالی نظموں ت پر۔ انھیں کیا معلوم کہ ان نظموں کے بدولت دو وقت کی روٹی نہیں پکائی

جاسکتی ۔تمہارے جھولے اور داڑھی پر مرتی ہیں ۔تمہارے ساتھ رہ کر دیکھیں ۔دو دن میں آٹے دال کا بھاؤ نہ پتا چل گیا تو کہنا! بڑی ہوا میں اڑتی پھرتی ہیں۔''

''میں کتنی بھی پاگل ہوں ۔ یہ سب میں کہہ رہی ہوں ۔ میں...... جو خود اتنی پاگل تھی ۔آج سے پچیس سال پہلے یاد کروں تو دل دہل جاتا ہے ۔تمہارے پیار میں مرنے مٹنے کو تیار تھی ۔لگتا تھا دنیا کا ہر راستہ تم تک جاتا ہے ۔تمہارے خطوں کی ایک ایک سطر مجھے زبانی یاد تھی ۔تمہارے ایک ایک خط کو پچیس بار پڑھتی تھی ۔تمہاری خوبصورت ہینڈ رائٹنگ کی گھنٹوں مشق کیا کرتی تھی ۔تمہاری داڑھی میں مجھے عیسیٰ مسیح نظر آتے تھے ۔کندھے پر بال بکھرے ہوئے مجھے تم دنیا کے سب سے خوبصورت انسان معلوم ہوتے تھے ۔کتنی پاگل تھی میں! سوچتی تھی، تم مل جاؤ مجھے بس اور کچھ اور نہیں چاہیے ۔شادی ہوئی نہیں کہ سارے مصنوعی رنگ واضح ہو گئے ۔سال بھر کی نون تیل لکڑی میں سب ہوا ہو گیا ۔گھر کی پریشانیوں کی وجہ سے میرے بال تو سفید ہو گئے پر تم نہیں بدلے ۔رہے مجنوں کے مجنوں ہی......''

''کمال ہے، ایک ہفتے سے ٹیوب لائٹ خراب پڑی ہے، کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اڑھائی تو کمرے ہیں اس میں ایک روشنی نہیں ۔اگر ٹیوب لائٹ ٹھیک بھی ہو جائے کون سا اندھیرا دور ہونے والا ہے ۔ بھلا ہے بیٹھے رہو اندھیرے میں ہی ۔''

''اُف بجلی کا بل بھی نہیں بھرا تم نے ۔ ٹیلی فون تو کٹ ہی گیا ہے، بجلی بھی کٹ جائے گی ۔ پر تمھیں کیا! کہو گے، ایک عورت کا دماغ چل گیا ہے سارا دن بڑبڑاتی رہتی ہے ۔تمہارے ساتھ بائیس سال میں نے جس طرح سے کاٹے ہیں، کوئی بھی عورت پاگل ہو جائے گی ۔تم تو گھر میں بے غیرتی سے رہتے ہو ۔اب میں اسکول سے آدھی چھٹی لے کر جاؤں بجلی کا بل بھرنے ۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے ۔ میں بھی کتنی احمق ہوں کہ اب بھی تم سے کچھ امید رکھتی ہوں ۔ مجھے اب تک سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تم......چھوڑو کوس کوس کر اپنی زبان کیوں خراب کروں......''

''اب پھر جھولا اٹھا کر کہاں چل دیے؟ یہ کھانا جو تھالی میں چھوڑ کر اٹھ گئے ہو، کون کھائے گا؟ مت سمجھنا کہ میں اتنی شوہر پرست ہوں کہ تمہاری جوٹھی تھالی میں کھا کر ثواب کا کام کروں گی ۔تمھیں کھانے کی قدر کیا ہوگی! خود کماتے تو پتا چلتا کہ جھولا لے کر بڑی بڑی فلاسفی

ہانکنے سے گھر کا چولہا نہیں جلتا ،اس کے لیے صبح سے شام تک ہڈیاں گلانی پڑتی ہیں ،تب جا کر......لیکن تم پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پتا نہیں کون سے مٹی کے بنے ہو......''

''اب جا ہی رہے ہو تو اپنا یہ لو لیٹر لے جاؤ یا د رکھنا ،مجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے۔اس سے کہہ دو آنے کو تیار رہے تو میری طرف سے کوئی پریشانی نہیں۔آئے سنبھالے تم دونوں کو۔میری جان چھوٹے۔بائیس سالوں میں یوں بھی کتنی جان باقی رہ گئی ہے۔''

''اس لیے نہیں کھانے بیٹھی تمہاری تھالی میں کہ معزز شوہر کی عزت وافزائی کروں۔اپنی کمائی کا درد مجھے نہیں ہوگا تو کیا تمھیں ہوگا؟ بھری تھالی چھوڑ کر جھولا اُٹھائے اور چل دیے۔''

''لیکن جاؤ گے کہاں؟ دیر یا جلدی یہیں آ ؤ گے خالی ہاتھ ہلاتے......''

● ● ●

لب کشائی کا بہترین طریقہ
معاشی طور پر خود کفیل ہونا

کہانی لکھنا میرے لیے شوق یا روزمرہ کے روٹین کا حصہ نہیں ہے۔ کسی بھی کہانی کو اس وقت نہیں لکھتی جب تک کہ اس کہانی کے کردار میرے دماغ میں ہلچل نہ کر دیں، اور خود بہ خود کاغذ پر اترنے کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں۔ میرے یہاں باقاعدہ سوچ سمجھ کر یا کسی مدیر کی فرمائش کے تحت لکھی جانے والی کہانیاں انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہیں۔

مذکورہ زمرے کی کہانیوں میں ''بولنے کا حق'' کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ''رہو گی تم وہی'' کے متبادل کے طور پر یہ کہانی لکھی گئی۔ ''بولنے کا حق'' کہانی میں ایک کماؤ عورت بول رہی ہے اور اس کا شاعر شوہر خاموش ہے۔ سب عورتیں نہیں بولتیں، نہیں بول سکتیں۔ اس کہانی پر ایک مصنف کی بیٹی نے بہتر جواب دیا تھا کہ جو گھر کی تمام ضرورتوں کو رات دن ایک کر کے پورا کرے تو وہ بولے گی بھی۔ گھر کے لیے دی گئی قربانی ہی اس کے بولنے کی وجہ ہے۔ عورت صرف اس وقت بولے گی جب وہ معاشی اعتبار سے مضبوط ہوگی۔ ہر سماج میں اُسی کی بالا دستی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں معیشت ہوتی ہے۔ عورت کا معاشی اعتبار سے آزاد ہونا ہی سماجی تبدیلی کی پہلی شرط ہے۔ اس کے خود کفیل ہونے کے سبب بہت ساری تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ عورت کو معاشی طور پر مضبوط ہونے سے اسے طاقت کے ساتھ غلط اور صحیح فیصلہ لینے کی قدرت ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرد ہو یا عورت اگر وہ اپنی بالا دستی چاہے گا تو توازن خراب ہونا لازمی ہے۔

اس کہانی میں ہرفن والا شوہر کا کردار پیش کیا گیا ہے کہ گھر کی ذمہ داریوں سے دور خیالی دنیا میں رہتا ہے۔شوہر ہو یا بیوی اگر دونوں کی ذمہ داری بچوں کی صحیح پرورش کرنا ہے، کیوں کہ بچے میاں بیوی کی مشترکہ وراثت ہوتے ہیں۔لیکن بچوں کو لے کر ایک دوسرے پر تہمت لگانا شروع کر دیا کرتے ہیں، رہو گی تم وہی میں شوہر اس کی ذمہ داری بیوی پر ڈالتا ہے اور ''بولنے کا حق'' میں بیوی شوہر پر۔

جنوری 2003 میں جب ''بولنے کا حق'' کہانی شائع ہوئی تو مجھ سے بڑی میری سہیلی کا فون میرے پاس آیا۔ ''سدھا تمہاری کہانی کو پڑھ کر تو مجھے اپنا وقت یاد آ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ تم نے میرے ہی الفاظ لکھ دیے ہیں۔کئی بار طیش میں راجندر کو برا بھلا بول جاتی تھی۔میری زبان چھری کانٹے جیسی ہو جاتی تھی، میں تو اپنے کو ہی اس کہانی میں دیکھ رہی ہوں۔مجھے تسلی ہوئی کہ میرا خیالی کردار حقیقت میں بدل گیا تھا۔'' اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی تھی اس کہانی کی؟

دراصل اس کہانی میں ہمدردی کا کردار مرد ہے، عورت تو مضحکہ خیز انداز میں بڑبڑاتی رہتی ہے۔پھر بھی یہ الزام اگر مجھ پر لگایا گیا کہ جہاں صرف مرد بولتا ہے وہاں مظلوم کردار عورت ہے۔لیکن جہاں عورت بولتی ہے وہاں ہمدردی مرد کے لیے نہیں پائی جاتی۔ہو سکتا ہے یہ الزام صحیح ہو یہ عورت کے لیے میرا ہمدردی کا رویہ ہے، اس کے لیے میں ملزم ہوں۔

● ● ●

کہانی

ڈیزرٹ فوبیا یعنی سمندر میں صحرا

دن، ہفتے، مہینے، سال، تقریباً پینتس سالوں سے وہ کھڑکی کے پاس جاکر سمندر کی اُچھال مارتی لہروں کا نظارہ کرتی تھی، لیکن ان موجوں کو دیکھنے کے بعد بھی، اس کی حالت ایک خوبصورت بے جان کیلینڈر کی طرح تھی جہاں نہ کوئی ہل چل تھی نہ اُبال صرف سکوت اور ٹھہراؤ تھا۔

''آنٹی، تھوڑی شکر چاہیے۔دروازے کی گھنٹی کے بجنے کے ساتھ ساتھ سات آٹھ سال کے دو بچوں میں سے ایک نے خالی کٹورا آگے کر دیا۔''

''بچوں کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش کے قریب پہنچ کر انھوں نے خالی کٹورا لیا اور خود باورچی خانے میں جاکر چینی سے بھرنے کے بعد لاکر انھیں دے دیا۔''

''سنبھالنا۔انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک کا گال تھپ تھپایا اور متجس نگاہوں سے دیکھا۔پوچھا کچھ نہیں۔

''وہاں''۔ بچے نے آنٹی کی خوشگوار مسکراہٹ میں سوال پڑھ کر پڑوس کے فلیٹ کی جانب اشارہ کیا، جو کسی بڑی کمپنی کا گیسٹ ہاؤس تھا،''وہاں سے ابھی آئے ہم لوگ!''

''دبا......ئی، سے......''وِیدسیا انداز میں''آ'' کو کھینچتے ہوئے بڑی لڑکی نے کہا۔پیچھے سے نام کی پکار سن کر ایک نے دوسرے کو ٹوکا۔واپس جاتے بچوں کو وہ ایک ٹک دیکھتی رہی۔ایک کھل کھلاہٹ کے ساتھ۔''تھینک یو آنٹی''انھوں نے ہاتھ اوپر کر ہلایا اور بے دلی سے پلٹ گئی کھڑکی کی جانب۔ان کے پیچھے پیچھے ہوا میں''تھینک یو آنٹی''کے لفظ سنائی دے رہے تھے۔

''تیس سال پہلے سمندر ایسا مٹ میلا نہیں تھا۔چڑھتی دوپہر میں وہ آسمان کے ہلکے

نیلے رنگ سے زیادہ نیلا دکھائی دیتا۔ آسمانی نیلے رنگ سے تین شیڈ گہرا، لگتا۔ ایسے کہ کسی مصور نے سمندر کو پرکھنے کے بعد اسی نیلے رنگ میں سفید ملا کر اوپر کے آسمان پر رنگوں کی کوچی چلا دی ہو۔ آسمان اور سمندر کو الگ کرتی بس ایک گہری نیلی لکیر۔ ڈوبتا سورج جب اس نیلی لکیر کو چھونے کے لیے آہستہ آہستہ نیچے اترتا تو لال گلابی رنگوں کا طوفان اٹھتا اور وہ سارے کام چھوڑ کر اٹھتی اور کوچی لے کر اس اڑتے عبیر کو کینوس پر اتارنے کی کوشش کرتی۔ ایک دن، دو دن، تین دن تصویر پوری ہونے پر کھڑکی کے باہر کی تصویر کا اپنی تصویر سے موازنہ کرتی اور اپنی انگلیوں پر فریفتہ ہو جاتی۔ انھیں تھام لیتے آفس سے واپس ہوتے صاحب کے مضبوط ہاتھ اور انگلیوں پر ہوتے صاحب کے نم ہونٹ۔

دس سال بعد ایک دن اچانک گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے پر۔ بچے واپس پنچ گنی کے ہاسٹل واپس آ گئے، انھیں سمندر بدرنگ سا نیلا لگا، جس میں جگہ جگہ نیلے رنگ کے دھندلائے چکتے تھے۔ کھڑکی کے باہر دکھائی دیتا سمندر پہلے سے زیادہ وسیع تھا۔ ویسے ہی لامحدود وسعت انھیں اپنے اندر محسوس ہوئی۔ ان کا دل کیا کہ اس غیر آباد لامحدود وسعت پر گھر واپس آتے ہوئے پرندوں کی ایک قطار بنا دیں۔ جن کے اڑنے کا عکس سمندر کی لہروں پر پڑتا ہو۔ انھوں نے پرانے سامان کے ذخیرے سے کینوس اور کوچی نکالی، پر کینوس سخت اور کھردرا ہو چکا تھا۔ اور کوچی کے بال سوکھ کر اکڑ گئے تھے۔ وہ بار بار کھڑکی کے باہر کی تصویر بدلنے کی کوشش کرتی، پر اس کوشش کو ہر بار ناکام کرتا ہوا سمندر، پھر سمندر تھا، ضدی، خوفناک اور مسخرے کرنے والا۔

اس مسخرے سمندر کے کنارے کچھ عورتیں ''محبت'' میں بچوں کو گھما رہی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی کی کمر میں بندھے پٹے کے ساتھ بچے کا کیریئر وابستہ تھا، اور بچہ بندریہ کے بچوں کی طرح ماں کے سینے سے چمٹا تھا۔

''مجھے اپنا بچہ چاہیے'' صاحب کی باہوں کے گھیرے کو ہتھیلیوں سے کستے ہوئے ان کے منھ سے ہلکا سا لفظ نکل گیا۔

صاحب کے ہاتھ جھٹکے سے الگ ہوئے اور بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو اٹھا کر منع کر دیا۔ فریم جڑی ہوئی تینوں بچوں کی ہنسی کے ساتھ صاحب کی انگلی میں پہنی انگوٹھی کی چمک اتنی

تیز تھی کہ وہ بول ہی نہیں پائیں کہ ان کا بچپن کہاں دیکھا ہے انھوں نے۔ وہ جب اس گھر کی بہو بن کر آئیں تو آٹھ، دس اور چھ سال کے تینوں بیٹوں نے اپنی چھوٹی ماں کا خیر مقدم کیا تھا اور وہ دہلیز پار کرتے ہی دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہوگئیں تھیں۔

وہ اپنے فلیٹ کی دسویں منزل سے سب کو اس وقت تک دیکھتی رہی، جب تک کہ سمندر کی طوفانی لہریں خاموش نہ ہوئیں۔ اور سامنے دلفریب منظر پر سکوت طاری ہوگیا۔

نہ جانے کب وہ طوفان مارتا سمندر خاموش اور ریگستان میں بدل گیا۔ وہ کھڑکی پر کھڑی ہوتی تو انھیں احساس ہوتا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے سمندر نہیں بلکہ دور دور تک پھیلا ایک خشک صحرا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی نم آنکھوں میں کرکری محسوس کرتی اور وہاں سے ہٹ جاتی۔

''تمھیں ڈیزرٹ فوبیا ہوگیا ہے''۔ صاحب ہنستے ہوئے کہتے ''اس کا علاج ہونا چاہیے''۔

صاحب کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ ماضی بن گئے۔ پیچھے چھوڑ گئے بے شمار جائداد اور تین بیٹے۔ اس کے بعد وہ کورٹ، کچہری کے قانونی داؤں پیچ میں پھنس گئی۔ تینوں بیٹوں کے گھیرنے پر انھوں نے کہا کہ مجھے صاحب کے جمع کیے گئے بینک بیلینس اور فارم ہاؤس نہیں چاہیے۔ صرف یہ گھر ان سے نہ چھینا جائے۔ انھیں یہ احساس ہوا کہ جینے کے لیے یہ ریگستان بہت ضروری ہے۔ گھر انھیں ملا پر بچے دور ہوگئے۔ تینوں بیٹے اب بیرون ملک میں تھے زمین جائداد کی دیکھ ریکھ کے لیے سال چھ مہینے میں آجاتے تھے۔ لیکن آنے کے بعد چھوٹی ماں کے دروازے پر دستک دینا اب ان کے لیے ضروری نہیں تھا۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے فریم میں جڑے لینڈ اسکیپ کا حصہ بن گئیں۔

''آنٹی''، ہم لوگ آج واپس دوبئ چلے جائیں گے'' اسی طرح ''آ'' کو کھینچتے ہوئے بڑی لڑکی نے کہا'' ہامرے گرینڈ پا مطلب ہمارے نانا لینے آئے ہیں۔ چلیے ہمارے ساتھ ان سے ملاقات کراتے ہیں۔'' بچوں نے دونوں جانب سے انگلی پکڑی اور منع کرنے پر بھی گیسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ ان چار دنوں میں بچے ان کے ارد گرد رہے۔

صوفے پر ایک عمر رسیدہ شخص اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ انھیں دیکھتے ہی جلدی سے اٹھے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔'' بچے آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ آنٹی اتنی اچھی پینٹنگ

بناتی ہیں، آنٹی کی کھڑکی سے اتنا اچھا ویو دِکھتا ہے۔'' بولتے بولتے وہ رکے، چشمہ ناک پر دبایا اور آنکھیں دو، تین بار جھپکا کر بولے۔''اگر میں غلط نہیں تو یو آر چھوی''؟

چھوی، چھوی، چھوی، جیسے کسی حادثے میں قوت احساس خراب ہو جائیں، وہ جہاں تھی وہیں کھڑی، جیسے سچ مچ بت بن گئیں۔

''ہاں...... پر...... آپ؟'' بولتے ہوئے اپنی آواز کسی کنواں کے اندر سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''نہیں پہچانا؟ میں...... مہیش۔ کالج میں تمہارا مجنوں نمبرون......! بول کر وہ ٹھہا کہ مار کر ہنس پڑے، ''تم بھی اب نانی دادی بن گئی ہوگی پوتے پوتیوں والی...... اپنے صاحب سے ملاقات کراؤ''۔

انھوں نے آنکھیں جھکائی اور سر ہلا دیا۔''وہ نہیں رہے''

''سوری مجھے معلوم نہیں تھا!'' ان کی آواز میں شرمندگی تھی۔

کچھ سیکنڈ کی خاموشی ان دونوں کے بیچ پھیل گئی جو برسوں کے طویل فاصلے کو عبور کرنے کی کوشش میں، ایک ہی جھٹکے میں بکھر گئی تھی۔

''چلتی ہوں''...... وہ اپنے گھر کی طرف چل دیں۔

پیچھے سے چھوٹے بچے نے ان کا پلو پکڑ کر''آنٹی، آنٹی''

وہ پلٹیں! بچے نے ایک پل ان کی خاموش آنکھوں میں دیکھا پر محبت بھرے انداز میں بولا۔

''آنٹی یو آر این اینجل''۔

وہ مسکرائیں، گرم ہاتھوں سے گال سہلایا، پھر گھٹنے موڑ کر نیچے بیٹھ گئیں، اس کی پیشانی چومی''تھینک یو'' اور گھر کی جانب قدم بڑھائے۔

کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے چابی گھمائی۔ دروازہ کھلا۔ دیواروں کی پنٹینگس کے کونوں پر لکھا ان کا چھوٹا سا نام وہاں سے نکل کر پورے کمرے میں پھیل گیا تھا۔ کمرے کے درمیانی حصے میں وہ نام ان کا منتظر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہوتے ہی وہ گر گئیں۔ جیسے برسوں بچھڑے دوست سے گلے مل رہی ہوں۔ کھڑکی کے باہر ریگیستان آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہونے لگا تھا۔

اور نہ جانے کس طرح کھڑکی کے باہر ہلوریں لیتا ریگستان اڈتے سمندر کی طرح بنا کسی روک ٹوک کے کمرے میں داخل ہو گیا۔اور سارے باندھ توڑ کر اُچھلتا ہوا ان کی آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔

• • •

گم شدہ وجود سے اچانک تصادم

یہاں ایکٹرس غریب طبقے یا متوسط طبقے کی نہ ہو کر اعلیٰ طبقے سے متعلق ہے۔ لیکن حالات میں کہیں نہ کہیں یکسانیت ضرور ہے۔ چال کے کمرہ نمبر ایک سو پینتیس سے آگے بنگلے میں رہنے والی پاک وصاف شوہر پرست عورت کو دیکھیں تو اسے بھی الگ نہیں پائیں گے۔ فرق صرف جسمانی تشدد سے ہٹ کر بہ ظاہر باریک تشدد کا ہے۔ تارابائی چال نمبر ایک سو پینتیس کی عورت کا جسم جہاں جلتی ہوئی سگریٹ سے داغا جاتا ہے، اشرافیہ طبقے میں خود کو پوری طرح قربان کرنے والی عورت کے لیے، اپنے شوہر کی ہیرا پہنی ہوئی انگلی کا اشارہ ہی اسے خاموش کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

عموماً غریب گھر سے لے کر اشرافیہ طبقے کی سیکڑوں عورتوں کی مثالیں مل جائیں گی کہ شادی کے بعد اپنی مصوری، سنگ تراشی، نظمیہ کہانی کی فنکارانہ صلاحیتوں یا گھر کی بے کار اشیاء سے دیواروں کو آراستہ کرنے کی خوبی حتیٰ کہ سلائی بنائی رنگ بہ رنگوں والی قصیدہ کاری کو فراموش کر یک سوئی سے ساس سسر، جیٹھ جیٹھانی، بچے بوڑھوں کی ٹولی کو خوش رکھنے اور گھر کی رونق بنائے رکھنے کی خیر سگالی میں اپنی پوری زندگی بے رونق اور بدرنگ بنا ڈالتی ہیں۔

''چھوی'' ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی بیوی کی کہانی ہے۔ جو بچے نہ ہونے کی کمی کو دور کرنے کے لیے اور خود کو احساس کمتری سے نکالنے کے لیے بار بار اپنی فنی خوبی یعنی مصوری کی جانب آنا چاہتی ہے۔ اپنی خودی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن زندگی کے حادثات، شوہر کی موت اور سوتیلے بچوں کی توجہ کا مرکز نہ ہونا اسے بہت تکلیف دیتا ہے۔ اچانک

سے پڑوس میں آئے دو چھوٹے بچوں کے پیار کا مرکز ہو جانا''۔آنٹی یو آر انجل''اور پرانے دوست کا ''چھوی'' نام یاد کرا دینا، اسے ایک لمبی نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیتا ہے۔ایک نام، ایک وجود، جسے وہ شادی کے پینتیس سالوں بعد بھول گئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب عورت کو کوئی شخص یا کوئی حادثہ بیدار کرتا ہے تب تک وہ عمر کی کئی دہائی گزار چکی ہوتی ہے۔وہ اپنے گھر کی اس بے جان چوکور کھڑکی کا حصہ بن جاتی ہے، جہاں باندھ توڑ کر گھر میں داخل ہوا، ہلوریں لیتا ہوا سمندر بھی ان کی زندگی کو متاثر نہیں کر پاتا۔

عام طور پر ایکسپریمینٹل کہانیاں مجھے توجہ نہیں دلاتی۔ پر اکثر ہوتا ہے کہ کہانی خود اپنی خدوخال تیار کر لیتی ہے۔ یہ میں بہت مغروریت سے نہیں شرمندگی کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ کبھی کبھی مجھے ایکسپریمینٹل کہانیوں کا کیڑا کاٹتا ہے۔''نئی شاخ لیکن مرجھائی ہوئی'' شاید کہانیوں کی شعریات اسے ہی کہتے ہوں گے، لیکن ایک اشرافیہ طبقے کی عورت کے غیر مرئی دکھ (یوں اولاد نہ ہونے کی مجبوری کے غم کو اور غیر مرئی نہیں کہنا چاہیے) جو غریبی، بھوک اور بد حالی سے علاحدہ ہے۔اس طرح کی گڑھی کہانیوں میں یہ خطرہ ضرور رہتا ہے کہ وہ ''کہانی'' کا کبھی کبھی گلا گھونٹ دیتا ہے۔ یہ کہانی کتنی کامیاب ہوئی ہے یہ تو قارئین ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔

● ● ●

کہانی

کرواچوتھی عورت

گھر میں کتیا اور کمپیوٹر ایک ساتھ آئے تھے، اس لیے سب نے بھورے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی کتیا کا نام فلاپی رکھ دیا تھا۔

آج کرواچوتھ کا ورت تھا اور فلاپی سو رہی تھی۔ اکثر وہ پانچ بجے ہی سویتا کو اٹھا دیتی ہے پر اس نے آج چھ بجے اٹھایا، جب سورج کی روشنی آسمان پر پھیل چکی تھی۔ سارگی ''سحری'' کا وقت نکل چکا تھا۔ ہر سال کی طرح صبح کھانے کے لیے سویتا کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔ لیکن اکثر اٹھ بھی جاتی تھی تو صرف ایک پیالی چائے پی لیتی تھی۔ کرواچوتھ کا ورت رکھنے والی دوسری شادی شدہ عورتوں کی طرح شوہر کی لمبی عمر کی دعا کرتے ہوئے سارا دن بنا پانی کا روزہ رکھنے کی تیاری میں صبح سورج نکلنے سے پہلے پوری سبزی یا بھر پیٹ ناشتہ کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

فلاپی نے صبح بیدار ہوتے ہی اپنے بھورے بالوں کو اسپینس ڈانسر کی اسٹائل میں جھٹکا اور صبح کا اعلان کیا، دوسری طرف سویتا نے غصے میں اپنا سر جھٹک دیا۔ اب سارا دن چائے کی طلب پریشان کرے گی۔

''چل فلاپی، آجا'' وہ ہونٹوں سے بدبدائی تو فلاپی چوکس ہو کر اچکی۔

دونوں سڑک پر تھے۔ فلاپی گلے میں پٹا پہننے کی خوگر نہیں تھی۔ دوسرے کتوں کی طرح مالک کے پیچھے دم ہلاتے نہیں چلتی تھی۔ اس کے قدم آزاد تھے اور وہ سویتا کے آگے آگے، من چاہی راہ پر اتراتی ہوئی چلتی تھی۔ بیچ بیچ میں سر ہلا کر دیکھ لیتی تھی کہ سویتا پیچھے آ رہی ہے یا نہیں۔ یہ گلی یہ علاقہ اس کا پشتینی تھا۔ اپنے علاقے میں کسی دوسرے کتے کا آنا اسے برداشت نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سڑک پر ایک کوا دیکھ کر وہ شیرنی کی طرح دہاڑتی، ہرنی جیسی چال سے کوؤں کو دوڑا کر ہی دم لیتی۔ اس کے بعد وہ شان سے

سویتا کی طرف فتح یابی کی مسکراہٹ ظاہر کرتی۔فلاپی نے صبح کا کام مکمل کیا تو سویتا نے واپس چلنے کا سگنل دیا۔فلاپی چلنے میں نخرے دکھاتی پھر احسان جتا کر وہ سویتا کے قدموں کی پراوہ کیے بغیر گھر پہنچ گئی۔

بغیر پانی کا ورت شام تک بے بس کر دیتا ہے۔اس لیے سویتا نے دوپہر بارہ بجے ہی شام کا ڈنر تیار کر دیا تھا۔فلاپی کو بھی آج ویجی ٹیرین کھانا ملے گا۔سویتا نے چاول میں سبزیاں ڈال کر اس کا کھانا تیار کر لیا۔

فلاپی اتراتی ہوئی آئی دہی پلاؤ کو شوں ،شوں کر سونگھ کر اکڑ پونچھ کے ساتھ غصے بھرے انداز میں بیٹھ گئی۔سویتا کی دو بیٹوں میں تیسری نک چڑھی بیٹی تھی۔

''نخرے مت کر !آج تمھیں یہی کھانا ملے گا''سویتا نے اس سے کہا ''نہیں کھانا ؟ٹھیک ہے مت کھا جب بھوک لگے گی تب خود سے کھائے گی۔

فلاپی نے ترچھی نظر سے سویتا کو دیکھا۔اور کیٹر پیلر کی طرح ہاتھ پیر سمیٹ کر زمین سے منھ لگا کر لیٹ گئی۔

شام کو دونوں بیٹیاں اسکول سے واپس آئیں۔دونوں نے اسے چمکارا۔''ہائے سیوٹی پائے ،وہائے ڈِڈنٹ یو اِٹ؟ چھوٹی نے کھانا دیکھا تو ناک بھوں سکوڑے ماما،آپ اسے گھاس پھوس کھانے کو کیوں دے دیتے ہو؟ہاؤ کین شی اِٹ دس راٹن فوڈ ؟ پھر فلاپی کو گود میں لے کر چمکارا۔''اوہ مائی ڈارلنگ یو آر ہنگری،وہاٹ آ پٹی''

اپنے پاپا کے واپس آتے ہی بیٹیاں شکایت کا پلندہ لے کر حاضر ہو گئیں۔''پاپا دیکھو نا'' مام اِذ ٹارچنگ پوئرلِٹل سول''

سویتا نے ہنس کر کہا''آج فلاپی نے سحری میں میرے ساتھ کروا چوتھ کا ورت رکھا ہے''۔وہاٹ اَرابش ،یو کانٹ بی سو کروئل''بوکھلائے ہوئے صاحب مضبوط قدموں کے ساتھ باورچی کھانے میں داخل ہوئے ،ڈیپ فریجر سے فلاپی کا من پسند پورک منسڈ نکلا ،ڈِفراسٹ کیا اور گیس پر رکھ دیا۔

فلاپی نے مزے لے لے کر کھانا صاف کیا اور ہمیشہ کی طرح سویتا کی ساڑی سے منھ رگڑ کر صاف کیا۔چھوٹی بیٹی نے فلاپی کو شاباشی دی۔''گڈ گرل ،دیٹ واپنشمنٹ ،ممی کی کروا چوتھ

اسپیشل' لالا ساڑی خراب کردی۔ بڑی بیٹی نے پاپا کی طرف سے فرمائش کی۔ ''فلاپی کو تو پاپا نے کھلا دیا، اب آپ پاپا کے لیے تھوڑے سے چپس فرائی کردو۔ پلیز۔ ماما۔ ہمیں بھی بھوک لگی ہے۔''

سویتا اٹھی سوکھتے گلے سے تھوک سے تروتازہ کیا اور آلو کی چپس فرائی کر، سر پکڑ کر لیٹ گئی۔ سحری میں چائے نہ پینے کی سزا تھی۔

سورج شام کو جب ڈوب رہا تھا، سویتا نے لال گلابی ساڑی پہنی عورتوں کے ساتھ دائرہ کار بیٹھ کر پوجا کی۔ جب سب ہاتھ جوڑ کر بیٹھی تھیں۔ فلاپی نے آہستہ سے دایاں پنجہ بڑھا کر پوجا کی تھالی کا لال کپڑا سرکایا اور کاغذی بادام کے دانے منھ میں رکھ لیے۔ سویتا گلے سے غرائی تو چھوٹی بیٹی فلاپی کو نومولود بچے کی طرح گود میں لے کر سہلانے لگی۔ فلاپی پر ہینڈل ودھ کیئر کا لیبل لگا تھا۔ کچھ بھی کہنا بے کار تھا فلاپی کے سات خون معاف تھے۔

اس بار پکی چوتھ تھی۔ چاند دیر سے نکلنے والا تھا۔ میز پر ڈھکا ہوا کھانا سب نے گرم کیا۔ مزے لے لے کر کھایا اور کھاتے ہوئے چاند کے نہ نکلنے سے پریشان ہوتے رہے۔

آخر چاند نکلا۔ سویتا نے جالی کے پیچھے سے چاند کو دیکھا۔ سر جھکایا اور ہاتھ جوڑ کر من ہی من میں کہا۔ ''ہے گورجا ماتا، اگلے جنم میں اگر مجھے انسانی یونی میں جنم نہ ملے تو پشو یونی میں مجھے گھر کی کوئی پالتو کتیا بنا دینا، تاکہ میں کرواچوتھ کے دن اپنا جوٹھا منھ کسی سہاگن کی لال ساڑی کے پیچھے صاف کرسکوں''۔

دراوازے پر بیٹھی فلاپی نے نیم بند آنکھوں سے سویتا کو دیکھا اور زبان باہر رال ٹپکاتی ہوئی اونگھنے لگی۔

● ● ●

ایک ''پارسا گھریلو عورت'' کی اوقات......

کرواچوتھی عورت ۔ یہ کہانی کرواچوتھ کے ورت کے دن کی کہانی ہے۔گھر کا پالتو کتا یا کتیا بے حد جذباتی اور پیارا جانوار ہوتا ہے۔بچپن سے ''یعنی جب وہ صرف ایک بالشت کا ہوتا ہے'' وہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے اور اس کی قدر گھر کے دوسرے افراد سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔وہ اس لیے کہ ہم انسان بول کر اپنا پیار اور غصہ افراد خانہ کے سامنے ظاہر کر دیتے ہیں۔پر یہ بے جان جانور صرف اپنی نم آنکھوں سے یا منہ گھوما کر اپنا پیار اور غصہ ظاہر کرتے ہیں۔اگر کوئی باہر کا شخص اس کا نام نہ لے کر اسے کتا یا کتیا بلائے تو ہم فوراً اس کا نام بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن اس کے برعکس اسے پال کر بڑا کرنے والی عورت کو کوئی عزت مل پاتی ہے۔؟

اس مختصر کہانی میں آواز ضرور مزاحیہ ہے لیکن بات اتنی سیریس ہے۔غور کریں کہ ایک پالتو کتیا فلاپی اور گھر کی مالکن کے بیچ مسلسل حالات سے نمٹنے کی کوشش جاری ہے۔جس میں عورت اور کتیا کا رول قریب قریب ریورسل ہے۔اور ان کا حساب کریں تو:

ایک ......گھر کی لاڈلی پالتو کتیا کا نام فلاپی اور اسے سب نام سے بلاتے ہیں، جب کہ گھر کی مالکن، دو بیٹوں کی ماں اور ایک عدد صاحب کی بیوی اپنے نام سے کم اور عہدے سے زیادہ جانی جاتی ہے۔

دو......فلاپی کا بیدار ہوتے ہی اپنے بھورے بالوں کو اسپینش ڈانسر کی طرح ناچ کر صبح کا اعلان کرنا اور کو یتا نام کی عورت کا جھنجلاہٹ میں دن کی شروعات کرنا ۔کیوں کہ اسے دن بھر چائے نہ پینے کی سزا برداشت کرنی ہے۔دونوں کے عہدوں کو ترازو سے تولنے

کی کوشش کرتے ہیں۔

تین......فلاپی گلے میں پٹا باندھنے کی عادی نہیں ہے اور دوسرے پالتو کتوں کی طرح مالک کے پیچھے دم ہلاتے چلنے کی خوگر نہیں ہے۔ جب کہ گھر کی عورت اس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتی اس کے حکموں کے مطابق راستہ طے کر رہی ہے اور گھر کی مالکن سے بے پرواہ فلاپی اپنے قدموں کے ساتھ اپنی آزادی کا اعلان کرتی ہے۔

چار......فلاپی کا علاقہ گھر کے اندر نہیں بلکہ گھر کی دہلیز کے باہر بھی پھیلا ہے۔ جہاں وہ اپنی گلی اور علاقے کی حکمرانی سمجھ کر شیرنی کی طرح دہاڑتی اور ہرنی کی طرح دوڑتی ہے۔ پر سویتا کا علاقہ دہلیز تک محدود ہے۔ جہاں وہ فلاپی کی زیادتی پر سوکھے گلے سے بڑبڑا سکتی ہے کیوں کہ اس گھر میں فلاپی کے سات خون معاف ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ہے کہ ایک گھریلو ''ہوم میکر'' عورت کی بے قدری کی لاتعداد وجوہات ہوسکتی ہیں۔ یہ بھی کہ شادی کے تیس پینتیس سال بعد بھی گھر کی مالکن کے طور پر کتیا جسے انگریزی میں ''بیچ'' کا خطاب پڑھے لکھے شوہروں کے ذریعے نوازا جاتا ہے۔ جو اس کی ذات برادری کی فلاپی کو گھر کے تمام افراد سے مل جاتا ہے۔

''ہمارے یہاں کچھ ورت، روزے ایسے ہیں جن کو کرنے کے بعد عورت اپنے شوہر کے پیر چھونے جاتی ہے اور شوہر، گاؤں دیہات کے عام لوگوں کی بات جانے دیں، شہر کے پڑھے لکھے لوگ بھی اس وقت پاک صاف پتی پرمیشور بنے بڑے آرام سے اپنے پیر آگے بڑھا دیتے ہیں۔ کیا مرد اس انا میں ڈوب نہیں جاتا کہ بیوی اس کا پیر چھوئے، اس کے قدموں میں لوٹے ؟ اگر کوئی اس بات کی مخالفت کرے تو ان کی یہ دلیل ہمیشہ ان کے پاس رہتی ہے۔ ارے، ہمیں تو یہ خود ہی بالکل پسند نہیں پر کیا کریں۔ بیوی کی خوشی کے لیے اسے مطمئن کرنے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔

بیوی کو ہر خوشی کا دعویٰ کرنے والے ایسے لوگوں میں سے دو ایک کو تو میں نے اپنی بیوی کو مارتے بھی دیکھا ہے۔ کچھ بیویاں اپنے جسم پر مار بھی برداشت کرتی ہیں اور کچھ اپنے جذبات کو پامال کرتی رہتی ہیں کیوں کہ برداشت کرنا تو بیویوں کے مقدر میں ہے۔

فیمن ازم سے پرہیز کرنے والی، فیمن ازم کے لقب سے بچنے کی کوشش کرنے والی منو جی کی کوئی بھی کہانی اٹھا کر دیکھ لیں اس میں اس طرح کے قول اور جملے ضرور مل جائیں گے۔ جنھیں لے کر عوتوں کے حقوق کا پرچم لہرایا جا سکتا ہے۔ منو کی اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں تو ایک پڑھی لکھی سمجھدار عورت کا ترقی پسند شوہر کی انا بھی اس بات سے بھری ہوتی ہے کہ اس کی بیوی نے اس کی سلامتی کے لیے کرواچوتھ کا ورت رکھا ہے۔ اور ایک عورت کو اس کے پیروں میں ڈال رکھا ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ چاند کے وقت سے نہ نکلنے کو لے کر اپنی پریشانی اور جھنجلاہٹ ظاہر کرتا ہے۔

ہر عورت ہندی فلم میں ہولی دیوالی کی طرح کرواچوتھ کے ورت تیوہارا پنے شادی کے لال جوڑے، سندور اور منگل سوتر پہنے گڑیا جیسی عورتیں ہاتھ میں تھال اور چلنی سے دکھتے چاند میں، اپنے پیارے شوہر کی تصویر کا اچھا خاصہ رنگ بہ رنگ کلوج سجاتی ہیں۔ جو آج بازار میں خاصہ بیچا جا رہا ہے۔ کرواچوتھ کے گانے کی سی ڈی تیار ہوتی ہے، سحری کی خاص مٹھیوں اور دودھ میں ڈال کر کھانے والی فینیوں سے میٹھائی کی دکانیں بھری پڑی ہوتی ہیں۔ ایک مشہور و معروف ٹویسٹ اس میں یہ دیا گیا کہ آج برابری کے حقوق پر مہر لگانے والا موڈرن شوہر ''باغبان میں امیتابھ بچن اپنی بیوی ہیما مالنی کے لیے اور دل والے دلہنیاں لے جائیں گے میں شاہ روخ خان نے اپنی ہونے والی بیوی کاجول کے لیے'' بھی بنا پانی کا ورت رکھتے ہیں۔ حقیقت میں کتنا اس پر عمل ہوا اسے ناپنے کا کوئی اعداد و شمار نہیں ہے۔ قارئین یا تو خود اپنی بیوی کے ساتھ بنا پانی کا ورت رکھیں اور یہ جانیں کہ چاند نکلنے تک بغیر پانی کے ورت رکھنے سے کیا حالت ہو سکتی ہے۔ یا پھر بیویوں کو اس فضول باتوں سے روکیں۔

● ● ●

کہانی

ایک عورت: 3/4

ایک تیس برس پرانہ گھر تھا۔وہاں پچاس برس پرانی ایک عورت تھی ۔اس کے چہرے پر گھر جتنی ہی پرانی لکیریں تھی۔

تب وہ ایک خوبصورت گھر ہوا کرتا تھا۔گھر کے کونوں میں ہرے بھرے پودوں اور پیتل کے نقاشی دار گلدان تھے ۔ایک کونے کی تکونی میز پر اخبار اور میگزین تھی۔دوسری طرف نٹراج کی خوبرو مورتی تھی۔کارنس پر رکھی ہوئی ماڈرن فریم میں جڑی، غیر ملکی شکل شباہت میں ایک صحت مند مطمئن جوڑوں کے درمیان ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔اس کے نزدیک میں سفید روئی بالوں والے جھبریلے کتے کے ساتھ ایک گول مٹول بچے کی تصویر تھی۔

گھر کے صاحب اور بچوں کی غیر حاضری میں بھی ان کا بکھرا ہوا سامان ان کے حاضر ہونے کی کہانی بیان کرتا تھا۔اس بکھرے ہوئے کو ترتیب دے کر گھر کو بہترین طریقے سے مزین کرتی ہوئی ایک خوب صورت عورت تھی ۔آخری انگلی پر ڈسٹر لپیٹے ہر جگہ کی دھول صاف کرتی ۔لذیذ کھانے کو دھنیے کی ہری ہری پتیوں سے سجا کر مختلف قسم کے برتنوں میں کھلاتی اور رات کو سب کے مسکراہٹ بھرے چہرے کو اپنے چہرے پر لحاف کی طرح اوڑھ کر سوتی تھی۔

مذکورہ مشغولیات کے بعد وقت نکال کر وہ عورت باہر بھی جاتی اور بچوں کی کتابیں لینے، صاحب کی پسند کی سبزیاں لینے، گھر کو گھر بنائے رکھنے کا سامان لینے ۔ہر مہینے کی مقررہ تاریخ پر وہ اپنی سہیلیوں کے گھر چائے پارٹی میں حصہ بھی لیتی لیکن ہمیشہ گھر سے باہر نکلتے وقت وہ ایک حصہ گھر میں ہی چھوڑ آتی ۔وہ حصہ گھر کے سیفٹی الارم جیسا تھا جس کا ایک تار اس عورت سے ملحق تھا۔اچانک باہر خریداری کرتے ہوئے یا سہیلیوں کے یہاں چائے پیتے ہوئے اس تین چوتھائی

عورت کا تار بجنے لگتا۔ وہ گھڑی کی جانب ٹک ٹکی لگائے دیکھنے لگتی اور اپنے چھوٹے ہوئے حصے سے ملنے کے لیے بے چین ہو جاتی۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دونوں حصے مقناطیسی انداز سے مل جاتے تو وہ اطمینان کی لمبی سانس لیتی۔ اسکول سے واپس آتے وقت بچوں کو دونوں بازوؤں میں بھر لیتی اور بچوں کے ساتھ صاحب کا انتظار کرنے لگتی۔ بچوں کی آنکھوں میں اپنی معصوم مانگ کو پوری ہونے کی چمک ہوتی کہ ماں دن بھر کہیں رہے پر انھیں اسکول سے واپس آنے سے پہلے گھر میں پسندیدہ ناشتے کے ساتھ ماں حاضر ہونی چاہیے۔ یہی ہدایت صاحب کی بھی تھی۔

ان ہدایتوں اور فرمائشوں کی سنہری چمک میں اس نے اس تبدیلی پر بھی غور نہیں کیا کہ اس کے دونوں حصوں میں کافی گہرائی بڑھتی جا رہی ہے۔ گھر میں چھوٹ جانے والا ایک چوتھائی حصہ آہستہ آہستہ پھیلتا گیا اور اس نے تین چوتھائی حصے کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ اب وہ باہر جاتی تو ایک چوتھائی حصہ ہی اس کے ساتھ جاتا۔ جسے دیکھ کر اس کی سہیلیاں اور رشتے دار آسانی سے نظر انداز کر دیتے۔ باہر کا سارا کام وہ جلدی جلدی نمٹا کر گھر واپس آتی تو دیکھتی کہ دوسرا حصہ ندارد ہے۔ دراصل اس حصے کی مقناطیسی کیفیت زائل ہو چکی تھی۔ وہ پورے گھر میں اسے تلاش کرتی۔ بچے جو اب بچے نہیں تھے، ہنس کر پوچھتے۔ ''کیا کھو گیا مام؟ ہم مدد کریں''؟

''نہیں میں خود دیکھ لوں گی'' وہ جھینپ میں کہتی''

یہاں اس کمرے میں تو نہیں ہے نا؟ پلیز......!''

بچے انھیں سمجھاتے کہ انھیں اپنا کام کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔

وہ کمرے سے باہر آجاتی اور حواس باختہ ہو کر ڈارئنگ روم کے کونے میں پڑے پھول دان سے ٹکرا جاتی، جہاں پلاسٹک کے پھلوں کے بیچ اس کا وہ حصہ اس قدر ڈھیلا ہوتا کہ پہلی نظر میں وہ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر پہچان میں بھی نہیں آتا کہ یہ وہی ہے جو پہلے دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی اچک کر اس سے جڑ جاتا تھا۔ اب وہ سیفٹی الارم کی طرح بجتا بھی نہیں۔ بنا سگنل کے بھی وہ وقت پر واپس ہی آجاتی۔

آنے کے بعد اس کے وقت کا ایک بڑا حصہ اسے گھر کے کسی کونے میں تلاش کرنے میں گزرتا۔ وہ بار بار بھول جاتی کہ گھر سے نکلتے وقت اسے کہاں چھوڑا تھا۔ کبھی وہ دیکھتی کہ لان

میں پانی ڈالتے ہوئے وہیں چھوڑ آئی تھی اور وہ اسے گیندے کی کیاری کے کنارے لگی ہوئی اینٹوں کی تکونی باڑ پر گرا ہوا ملتا۔کبھی وہ دیکھتی کہ دروازے کے پاس لگے سائن بورڈ کے پاس ہی جوتوں کے بیچ دھول مٹی کے بیچ پڑا ہے۔وہ اسے ہاتھ بڑھا کر سہارا دیتی ،اس کی دھول مٹی جھاڑتی اور سب کی نظروں سے بچاتے ہوئے دوپٹہ میں چھپا کر اپنے ساتھ لیے چلتی۔کبھی کبھی بچے ، جواب بڑے ہو گئے تھے،آتے جاتے پوچھ بھی لیتے'' یہ تم نے پلو میں کیا چھپا رکھا ہے؟''

''کہاں''! کچھ بھی تو نہیں'' وہ کچھ اور محتاط انداز میں اسے ڈھک لیتی اس امید سے کہ ان کے اگلے سوال پر وہ خود اسے نکال کر دکھا دے گی اور ان سے اس حصے کے متعلق صلاح مشورہ کرے گی۔لیکن بچے اپنی بڑے کاموں میں منہمک ہوتے کہ اس کے کچھ کہنے سے پہلے فوراً آگے بڑھ جاتے۔''اچھا!سم تھنگ پرسنل؟اوکے کیری آن مام!''

وہ گھر کی حالت دیکھ کر دُکھی ہوتی۔لکڑی کے فرنیچر کی وارنش بے رونق ہو گئی تھی۔گھر کے اندر کے پودے دھوپ اور ہوا کے بغیر مرجھانے لگے تھے۔ڈرائنگ روم کے صوفے کی گدیوں کی سلن ٹوٹنے لگی تھی۔دروازوں اور کھڑکیوں کے کانچ ٹرانس پیرینٹ نہیں رہ گئے تھے۔ڈرائنگ روم کے اوپر بیڈروم کی طرف جانے والی ریلنگ پر بے شمار دھول کی تہیں پڑی تھیں۔فریم میں جڑی تصویر کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔پورے گھر میں جیسے دھندلائی چادر پھیل گئی تھی اور ان سب کے بیچ بار بار گم ہوتا اس کے وجود کو خراب کرتا تین چوتھائی حصہ اسے بکھیر رہا تھا۔

اب وہ اسے ساتھ لیے لیے صاحب کا انتظار کرتی کہ شاید صاحب اس کے بے ڈول تخمینے کے بارے میں پوچھیں گے۔پر صاحب ٹھیک کھانے کے وقت پر بغیر اطلاع کیے دو چار مہمانوں کے ساتھ باہر کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر دیر سے واپس آنے کے بعد بھی وہیں ہوتے جہاں سے واپس آئے تھے۔پلکوں پر نیند حاوی ہونے تک وہ بائیں جانب فائلوں میں بزی رہتے۔ایسے منہمک انداز میں ان کی توجہ ہٹانا خطرے کی گھنٹی جیسے تھا جسے بجانے سے اس کھٹائی کے پھٹ جانے کا ڈر تھا، جسے لے کر وہ فکر مند تھی۔

سب کے سو جانے کے بعد اور اپنے سونے سے پہلے وہ اپنے پلو میں چھپے اس مردہ جسم کے ڈھیلے حصے کو تھپکی دے کر سلا دیتی اور پھر خود سو جاتی۔پر صبح جب اُٹھتی تو دیکھتی کہ اس کے اٹھنے

سے پہلے وہ حصہ جاگ کر صاحب کے پیروں پر کھڑا سب کے بیدار ہونے کا منتظر ہے اور رات بھر کی اچھی نیند سے کچھ سست ہے۔ سست سانوں کی وجہ سے صبح سے ہی اسے بے چین کر دیتا اس کا دل کرتا کہ اس ڈھیلے بیمار جسم کو اپنے حال میں چھوڑ کر اپنا بچا کھچا صحیح سالم تہائی چوتھائی حصہ لے کر ہی اس مٹ میلے گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ وہ اس بات کو غور سے سوچ رہی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

ایک صبح صاحب سو کر اٹھے پر اُٹھ نہیں پائے۔ وہ ابھی سو ہی رہی تھی۔ بیدار ہوئی تو دیکھا صاحب کے پیروں پر کھڑا اس کا وہ حصہ اپنا پورا زور لگا کر صاحب کو بستر سے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔ وہ جو اس پر پوری طرح منحصر تھا، جو اس کے سہارے کے بغیر جہاں کہیں بھی پڑا رہتا تھا۔ بغیر اس کی اجازت لیے آج اس قدر چوکنا اور متحرک دکھائی دے رہا تھا۔ پر اس حصے کی ساری محنت اور ترکیب بے کار گئی۔ صاحب پھر کٹے ہوئے پیڑ کی طرح گر گئے اور کراہنے لگے۔

اس نے فوراً ڈاکٹر حکیم بلائے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور بتایا کہ صاحب کی گردن اور پیٹھ کی نسوں میں سکڑن آگئی ہے اور ایسا برسوں صاحب کے ایک طرف جھکا رہنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ صاحب کار میں بیٹھتے تو ایک طرف جھک کر اخبار پڑھتے، چیئر مین کی کرسی پر بیٹھتے تو ایک فون پر بات کرتے ہوئے ایک جانب کھانا کھاتے۔ یہاں تک کہ وہ جب چلتے تو پِسا کی منار کی طرح ان کا ایک طرف جھکاؤ دور سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ اب جب کہ سیدھا ہونا چاہتے تھے ریڑھ کی ہڈی نے جواب دے دیا تھا۔ اس کی لچک ختم ہو گئی تھی اور وہ لوہے کی طرح سخت اور جنبش نہیں کر رہی تھی۔ ذرا سا ہلنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا اور ہلکے سے دباؤ میں بھی ہڈی ٹوٹنے کے امکانات تھے۔

پچاسوں دوائیاں، انجکشن، ٹریکشن، ڈائے تھرمی یعنی ہر ممکن علاج کیا گیا، پر صاحب کی کراہوں میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ دن، ہفتے، مہینے گزرتے گئے۔ ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ یہ مرض لاعلاج ہے اور پہلے کی طرح اب کبھی دفتر نہیں جا پائیں گے۔ ان کی نسوں کو ملائم کرنے کے لیے ورزش کرائی جانے لگی۔ وہ صاحب کے لیے دودھ، سوپ یا پھلوں کا رس لے کر آتی تو دیکھتی

اس کا وہ تین چوتھائی حصہ پہلے سے انھیں کسرت کرنے اور ان کی تیمارداری میں مصروف ہے۔

آخر کار دونوں کی محنت رنگ لائی۔صاحب بستر سے خود اٹھ کر بیٹھنے لگے، خود اٹھ کر غسل خانے جانے لگے۔دفتر سے فائلیں گھر آنے لگیں اور صاحب نے گھر پر ہی دفتر کھول لیا۔ڈاکٹر نے دیکھا تو انھیں آہستہ آہستہ چلنے کی ہدایت دے دی۔ان کے لیے ایک خاص قسم کی چھڑی بنوائی گئی، جسے حسب مطابق چھوٹا اور بڑا کیا جا سکتا تھا۔وہ چھڑی ان کے دائیں ہاتھ میں دے دی گئی۔پر صاحب کا بایاں حصہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اسے بھی سہارے کہ ضرورت تھی۔اس حصے کے لیے لکڑی کی یا میٹل چھڑی کارگر نہیں تھی۔اس جانب کے لیے ایک ایسی چھڑی کی ضرورت تھی کہ جو صاحب کے بائیں حصے کی طرز پر اپنے آپ کو ڈھال سکے۔اس کے لیے اس تین بٹا چار کے گوشت کے ٹکڑے سے زیادہ لچک دار اور کیا ہو سکتا تھا؟ صاحب کو بڑا چھوٹا اونچا نیچا جیسا سہارا چاہیے وہ پلک جھپکتے اپنے آپ کو اس سائز میں کر لیتا تھا۔

اس نے دیکھا، صاحب کی طبیعت میں بہتری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا وہ تین چوتھائی حصہ بھی صحت مند ہو رہا تھا۔اب بھی رات بھر صاحب کے پیروں کے پاس جاگنے کے باوجود اس کی سانسوں میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔اب اسے ڈھونڈنا نہیں پڑتا تھا۔باقی کی زندگی کے لیے صاحب کی بغل میں اس کی جگہ متعین ہو چکی تھی۔

• • •

اپنے لیے جینا کب سیکھے گی عورت؟

اس کہانی کی عورت پورے ایک طبقے کی عکاسی کرتی ہے۔ ہندوستان کی عورتوں کا ایک بڑا طبقہ صرف گھر کی نظر ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

ایک پڑھی لکھی ہندوستانی عورت کے لیے سانحہ یہ ہے کہ وہ پوری طرح گھر، شوہر، بچوں کے لیے مختص ہے۔ اپنی زندگی کا وہ خوب صورت لمحہ وہ بہترین طریقے سے گھر چلانے میں، اپنے شوہر کی پسند میں خود کو ڈھالنے میں اور اپنے بچوں کی پڑھائی اور ان کے مستقبل کو سنوارنے میں ختم کر دیتی ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو آگے بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھ کر وہ طویل عرصے تک اپنی خوشی کی انتہا میں رہتی ہے، جب اس کے سینچے ہوئے پودے تناور درخت بن جاتے ہیں اور اس کے محتاج نہیں رہتے، اس وقت وہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کا وجود اسے تلاش کرنے سے نہیں ملتا۔

گھر کی دیکھ بھال میں اس کے پیر اس قدر دلدل میں گھس جاتے ہیں کہ وہ اپنے کو چاہتے ہوئے بھی نہیں نکال پاتی۔ آخر کار گھر کا پورا جنجال اسے نگل جاتا ہے۔ یہ گھریلو عورت گھر کے فرنیچر اور دوسرے کاموں میں اس قدر مصروف ہو جاتی ہے کہ وہ ان سب کا ایک حصہ ہو جاتی ہے۔ وہ کسی کام سے گھر کے باہر جائے گھر کے کام اسے مقناطیس کی طرح اسے کھینچتے رہتے ہیں ۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ خود کو کبھی پورا کا پورا ساتھ نہیں لے جا پاتی۔ شروع سے ہی اپنا ایک چوتھائی حصہ گھر پر چھوڑ جاتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ تین چوتھائی حصے کو گھر گرہستی میں ایسا مصروف پاتی ہے کہ بڑی خوشی سے اپنے ایک چوتھائی حصے سے ہی مطمئن ہو جاتی ہے۔

چالس پینتالیس سال کے بعد عورت کو احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک فالتو سامان کی طرح

گھر میں پڑی ہے۔ بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں اور ماں ان کے لیے بہت بڑی ضرورت نہیں رہ گئی۔ شوہر کے لیے وہ ایک عادت بن چکی ہے۔ اب یا تو وہ پرانے زمانے کی عورت کی طرح اپنی قربانیوں کو یاد کر کے خوش ہو لے یا اپنے گزرے دنوں کو یاد کر کے آنسوں بہائے۔ ہوتا یہ ہے کہ اپنے گھریلو تخت سے معزول ہونے پر وہ بوکھلا کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے اور اپنے وجود کی تلاش میں پریشان رہتی ہے۔ اسے وہ مونو پیج یا ہارمونس اِن بیلینس کا نام دے کر خود کو بہلانے میں وہ ایک حد تک کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگر ایک عورت اس سے پہلے ہی سنبھل جاتی ہے تو اس میں کیا غلط ہے؟ اس نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسے شوہر اور بچوں کے مستقبل کے سنورنے تک خود کے بارے میں سوچنے کا حق نہیں ہے۔

اس کہانی کی تین بٹا چار عورت قصبے کی نہیں شہر کی ہے۔ کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شوہر کی زیادتیوں سے ازدواجی زندگی میں کھٹاس، طلاق پر پہنچی عورتیں بھی شوہر کی بیماری کی خبر پاتے ہی ایک نرس کی طرح ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ ان کی زندگی کا آغاز، ٹھہراؤ، اور اختتام گھر کی چہار دیواری کے اندر صرف ایک کردار کے ارد گرد مرکوز ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کی جماعت بہت بڑی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے بعد کی نسل اس رول سے باہر نکل آئی ہے، گھر اور باہر کی ذمہ داری زیادہ سمجھداری اور عزت کے ساتھ گزار رہی ہیں۔

● ● ●

کہانی

ڈر

دو پہر کے آرام کے وقت شیلف پر مسکراتی کتابیں تھیں۔

قرینے سے رکھی کتابوں میں ایک نئی دکھتی کتاب کو اس کی انگلیوں نے ہلکے سے باہر سرکالیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ ایک رومانی ناول تھا۔ سرورق پر ایک دل کش تصویر تھی۔

اس نے کچھ صفحات پر سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر پہلے صفحے پر اس کی نگاہ رک گئی۔ کتاب کے پہلے صفحے پر دائیں جانب اوپر کی طرف ایک میلی سی چپی تھی۔

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

وہ سوچتی رہی اور چپی کو کریدتی رہی جو اوپر سے چپکائی گئی تھی۔

اب وہاں کتاب کی جگہ صرف ایک چپی تھی۔

اس کے ناخن کند تھے۔ پھر بھی چپی کا ایک کونا نرم ہو کر کھلا۔

اس کی انگلیاں اب کام میں مصروف ہو گئیں۔ اسے صرف چپی نکالنی تھی۔ کتاب کا صفحہ خراب کیے بغیر۔

''کوئی فائدہ نہیں چھوڑ دے'' اس نے اپنی انگلیوں سے کہا، ''اس چپی کو ہٹانے کے بعد بھی اس کے نشان کتاب پر رہ جائیں گے۔''

پر انگلیوں نے سنا نہیں۔ وہ اپنے کام کو بخوبی کرنے میں منہمک رہیں۔ اس وقت تک کہ چپی اکھڑ نہیں گئی۔

اس کی مسکراہٹ پھیلنے سے پہلے ہی سمٹ گئی۔ چپی کے ساتھ تھوڑا سا کاغذ بھی اکھڑ گیا تھا۔ اس پر لکھا نام آدھا ر گڑ کھائے کتاب کے صفحات اور آدھا چپی پر تھا۔

وہ اپنی سوچ سے واپس آ گئی تھی۔اس نے چپی کو کانپتے ہاتھوں سے دلارا، صحیح کیا، ہتھیلی پر رکھا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔آئینے میں نام بالکل صحیح دکھ رہا تھا۔

ایک جادوئی تالا جیسے کھلا۔وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

پھر طاقت لگا کر اُٹھی۔اس نے اپنی انگلیوں کو کوسا۔کیوں وہ کوئی نہ کوئی خرافات کرتے رہنا چاہتی ہیں؟ کیوں؟

اس کے کانوں میں ایک رعب بھری آواز سنائی پڑی وہ تھرتھرانے لگی۔

اس چپی کے پیچھے پھر سے گوند لگا کر چپکانا چاہا۔پر کاغذ انگلیوں کے بار بار لگانے سے خراب ہو گیا تھا۔وہ گیلی چھاپ چھوڑ رہا تھا۔

اس نے کھلی کتاب کو دھوپ میں رکھا اور حواس باختہ ہو کر گھر میں ڈھونڈتی پھری ویسی ہی چپی کے لیے۔میز، دراز، شیلف، ڈبے، فائلیں، لفافے، الماریاں، ٹی وی کے اوپر کتابوں کے بیچ۔وہ چھپی ہوئی ڈاک ٹکٹ کے نیچے کا سادہ کاغذ تھا۔

آخر ملا وہ، پرانی ڈائری میں رکھے ڈاک ٹکٹوں کے ساتھ۔

اس نے اسی سائز کی چپی پھاڑی، ویسا ہی الٹا نام لکھا، اسے احتیاط سے چپکایا۔

پھر انگلی کو ذرا میلا کر اس پر لگا گھما دیا۔

اس چپی کو اس نے کئی زاویوں سے دیکھا۔

اب اس نے راحت کی سانس لی سب ٹھیک تھا۔

اس نے اطمینان سے کتاب کو شیلف پر مسکراتی دوسری کتابوں کے ساتھ پہلے کی طرح لگا دیا اور دوپہر کی فرصت اوڑھ کر لیٹ گئی۔

● ● ●

ایک عورت کا طویل مدت تک
خوف میں زندگی بسر کرنا

یہ ایک گھریلو عوت کی روزمرہ روٹین کی ایک دوپہر کی کہانی ہے۔

زیادہ تر عورتوں کے دن بھر کا ایک بڑا حصہ گھر اور بچوں کی پڑھائی میں گزر جاتا ہے۔دوپہر کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوتا ہے وہ اپنے لیے رکھتی ہے۔دوپہر کے ایک مختصر سے واقعے کے ذریعے سے ایک عورت کی کہانی ہے۔اس کہانی کے بارے میں عام قارئین نے یہی کہا کہ کہانی کے ذریعے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔تب میں نے اس کے عنوان کو''جمود'' کے بجائے''ڈر'' کر دیا کہ شاید یہ کہانی کچھ سمجھ آئے۔سمجھ آئی بھی،لیکن سب کے لیے نہیں۔کیوں؟اس کا بیان آگے......

اس کہانی میں عورت کے گھر کے شیلف میں جہاں کتابیں ہی کتابیں سجی ہیں۔اس شیلف میں دلکش سرورق والی رومانی ناول کو وہ پڑھنے کے لیے نکالتی ہے۔وہ کتاب اس کی نہیں ہے۔ظاہری بات ہے وہ کتاب اس کے شوہر کی ہے۔کتاب لیتے ہی اس کا ذہن دائیں جانب چسپا ایک میلی سی چپی کی طرف جاتا ہے۔متجسس انداز میں وہ اسے کریدتی ہے۔جیسے ہی کاغذ الگ ہوتا ہے اس کے ساتھ لکھا ہوا نام بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔آئینے میں اس کتاب کو دیکھتی ہے تو ایک جادوئی جالا جیسا نام کھلتا ہے۔کہانی میں اگر اس جگہ ایک لائن اور جوڑ دی جائے تو وہ نام اس کے شوہر کی معشوقہ کا ہے۔تو کہانی میں چھپے ہوئے سارے مطالب ظاہر ہو جائیں گے۔لیکن کبھی کبھی قارئین کے لیے بھی گنجائش چھوڑ دینی چاہیے۔

ایک گھریلو عورت اپنے گھر کے باشندوں کے ساتھ ساتھ گھر کی دیواروں سے بھی اس طرح محبت کرنے لگتی ہے کہ وہ اور کسی غیر ضروری باتوں کو اُٹھانا بالکل گوارا نہیں کرتی، جو اس کے خوش گوار ماحول میں خلل کا سبب ہو۔ جو حالات گھر میں خرابی پیدا کریں وہ انھیں ذرا بھی برداشت نہیں کرتی۔ اپنے شوہر کو معلوم نہیں ہونے دیتی کہ وہ اس کے معاشقے کے بارے میں جانتی ہے۔ وہ اپنے گھر میں ایک بہترین ماحول چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ عورت تب تک بے چین رہتی ہے جب تک کہ چپی لگ نہیں جاتی۔ نظر انداز کرنے کی اس خوبی کی وجہ سے پچھلے دور کی کتنی شادیاں ٹوٹنے سے بچ گئیں۔

یہ صرف ایک عورت کی کہانی نہیں ہے۔ تاعمر خوف میں زندگی بسر کرنے والی عورتوں کی تعداد کافی وسیع ہے۔ ایسی نہ جانے کتنی عورتیں ہیں جو خوف اور ڈر کے ہر لمحے کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں۔ جن کے کانوں میں اپنے شوہر کی رعب دار آواز بجنے سے وہ تھرتھرانے لگتیں ہیں۔

متوسط گھرانے کی تہذیب ایک ایسی جکڑ بندی ہے جو عورت کے وجود کو مجروح تو کرتے ہیں لیکن اسے احساس نہیں ہونے دیتے۔ جینے میں خلل پیدا کرنے والے تذبذب اور پریشانی کو کوئی گھریلو عورت ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی۔ اس فن میں تو عورتیں ماہر ہوتیں ہیں کہ ناسازگار ماحول میں بھی سازگار فضا بنالیتی ہیں۔ اور سب سے پہلے خود کو بہلانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ اور انجانے میں اپنے اس کام کے لیے خود کو شاباشی دیتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں بنا کسی طوفان اور بونڈر کے خاندانی نظام یوں نہیں قائم و دائم رہ گیا۔ اس میں کمزور کہلائی جانے والی عورتوں کے مضبوط شانوں کا اہم کردار ہے۔ اس نے صرف خاندان کی ذمہ داری ہی نہیں سنبھالی بلکہ پورے گھر کے مضطراب کی سلیب پر چڑھ کر خود کو قربان کردیتی ہے۔ لیکن جب بعد میں اس کا احساس ہوا تو ہارمونس کی خرابی کا بہانہ لے کر خود کو بہالالیتی ہے۔ کچھ نے یہ سمجھا کہ اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے اور انھوں نے کوہرے میں چھپے قوس قزح سے کچھ رنگوں کو واپس لے لیا اور اپنے اردگرد کوہرے کی دبیز چادر سے ایسا ڈھک لیا کہ پھر انھیں رنگوں کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

ایک شوہر کے لیے جہاں گھر آرائش اور آسائش کے علاوہ رعب دکھانے کی جگہ ہوتا

ہے اور یہی بیوی کے لیے جذبہ ایثار کے ساتھ ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دینے کا مقام ہوتا ہے۔گھر اور خاندان کے لیے وہ اپنا پورا وجود صرف کر ڈالتی ہے۔اور اسے رنج بھی نہیں ہوتا، کیوں کہ گھر ہمیشہ اس کے لیے سب سے ضروری ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ آج کی لڑکیوں میں خوداعتمادی پچھلی نسل سے زیادہ ہے، یہ خوداعتمادی ہی ان کی زندگی کا نمک ہے، اپنے حالات کو مستحکم کرنے کا جذبہ بھی ہے اور معلومات بھی۔وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا اور ناسازگار ماحول سے نمٹنے کا ہنر سمجھ رہی ہیں۔ایک حد تک وہ ناسازگار حالات سے باہر نکل آئی ہیں کیوں کہ وہ اپنے گھر کا اینٹ گارا خود بناتی ہیں، اس لیے ان تمام دباؤ سے باہر ہوتی ہیں جو انھیں کبھی بھی گھر سے بے گھر کر سکتے ہیں۔ایک عورت کا حق ہے کہ وہ اپنے گھر میں عزت کے ساتھ بنا کسی دہشت اور خوف کے زندگی بسر کر سکے۔

• • •

کہانی

نمک

روز کی طرح صبح نو بجے، پھر ساڑھے نو، ناشتہ میز پر سجا کر سِیا انتظار کرنے لگی۔ نہا کر باتھروم میں ٹائی کستے ہوئے شوہر، جنھیں سب صاحب کہتے تھے۔ اب دفتر جانے کے لیے نکلیں گے۔ سِیا نے کئی مرتبہ میز پر آراستہ چیزوں کا معائنہ کیا۔ ہر چیز اپنی صحیح جگہ پر تھی۔ پھولی ہوئی مونگ، کٹا ہوا پپیتا، سیب کے کچھ ٹکڑے، انار کے چھیلے ہوئے دانوں کے ساتھ پات گوبھی۔ کھیرا، ٹماٹر، ہرے پیاز کے پتے کا کٹا باریک سلاد، اور اس پر ڈالنے کے لیے دھنیے پودینے کی ہری چٹنی، اور کھٹی میٹھی املی کی چٹنی......زردی کے بغیر دو انڈوں کی بھرجی، چھاچھ کا گلاس۔ ساتھ ہی گاجر اور چقندر کا جوس......اور آخر میں کیتلی میں ڈھکی ہری چائے......

آفٹر شیو کی خوشبو سے چمکتے ہوئے صاحب ڈائنگ ٹیبل کی کرسی پر اس انداز سے آ کر بیٹھے جیسے قدیم زمانے میں راجہ مہاراجہ ہیرے جواہرات سے جڑے تخت پر بیٹھتے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی سِیا نے پتی کے ہاتھ میں تازہ رس نکالا جس کا ذائقہ لیتے ہوئے شوہر نے آہستہ آہستہ چسکیاں لیں اور خالی گلاس ایک کنارے پر رکھ دیا۔ اب کٹے ہوئے پھلوں کا نمبر تھا۔ اس کے بعد انڈے کی بھرجی کا پہلا نوالہ جیسے ہی ہونٹوں سے لگایا، چمچے کو کورل کی پلیٹ پر کھنکاتے، ناک چڑھا کر بولے، نمک کم ہے، ہوں! پھیکا! بدذائقہ!

نمک! چمچے کی آواز سے اسے تیس سال قبل کی ایک صبح یاد آ گئی جب اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، شادی کے فوراً بعد اس کی روزمرہ کی زندگی میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کا دن کا زیادہ تر حصہ تال میل بٹھانے میں گزر جاتا تھا۔ شادی سے پہلے وہ اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور ماں اس کے گھر سے نکلنے سے پہلے ناشتہ کی تھالی لیے ہوئے کھڑی رہتی تھی۔ شادی کے بعد کردار بدل

گیا تھا۔ اب اسے اپنا ناشتہ خود کرنا تھا پر اس سے پہلے اپنے صاحب کو ایسا بھر پیٹ ناشتہ دینا تھا کہ چار بجے تک انھیں بھوک نہ لگے۔

''اسکول میں نوکری''؟ صاحب نے منھ بنایا تھا۔ ''تمہارے نام سے ایک کمپنی کھول دی میں نے۔ میرا دوست اس کمپنی کا سب کچھ دیکھے گا۔ تمھیں صرف مالک کی طرح چیک پر دستخط کرنے ہوں گے''۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی، کہتی، اس کے ہاتھ میں کمپنی کے کاغذ دے دیے گئے۔ ''یہاں سائن کرو پروپرائٹر کی جگہ''! اور وہ مشین کی طرح دستخط کرتی گئی۔ ایک کے بعد ایک، جہاں جہاں صاحب نے پینسل سے کراس نشان لگایا تھا۔ اور اس کے عہدے میں اضافہ ہو گیا۔ ٹیچر کی جگہ وہ اب ڈائریکٹر تھی۔ صرف کاغذ پر۔

ایک دن وہ صبح ناشتے کے لیے میز لگا رہی تھی۔ تبھی صاحب کے اس دوست کا فون آیا جو کمپنی کا سارا کام دیکھتا تھا۔ کمپنی کے کام سے باہر جاتے ہوئے وہ ہوائی اڈّے سے فون کر رہا تھا اور اس نے تین چار کلائنٹ کو ضروری میسیج دینے کو کہا۔ بے شک وہ اس کمپنی میں صرف نام کی ڈائرکٹر تھی پر صاحب کی ہدایت تھی کہ ان کا دوست کوئی کام کہے تو وہ فوراً ہو جانا چاہیے۔

صاحب ہمیشہ کی طرح آئے کرسی پر بیٹھے، ناشتہ کیا اور نکل گئے۔ جب آفس سے واپس آئے تو سوجا ہوا منھ لے کر۔ وہ اندازہ لگاتی رہی کہ آخر ہوا کیا؟ ایسے خاموش کیوں ہو آخر؟ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔ اس سے کب کہاں کوئی غلطی ہوگئی کہ صاحب بات تک نہیں کرتے۔ بہت اصرار کرنے پر انھوں نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''میں پھیکا ناشتہ کر کے گیا، نمک کہاں تھا؟ تمہارے لیے میرے ناشتے سے زیادہ ضروری تھا۔ میرے اس دوست کا فون سننا۔''

اوہ! وہ سکتے میں آ گئی۔ جلد بازی میں وہ ناشتے کے وقت میز پر نمک اور کالی مرچ رکھنا بھول گئی تھی۔ پر صاحب نے نہ نمک مانگا نہ خود اٹھ کر باورچی کھانے سے لیا۔

''سوسوری ریلی''۔ اس نے بار بار معافی مانگی۔

''انگریزی جھاڑنے سے بچ جاؤ گی؟ ہوں، تم نے سمجھ کیا رکھا ہے؟ صاحب نے تین دن بعد اس کے ماں کے گھر جا کر اس کی شکایت کی، وہ ایسی بد چلن عورت کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہے، جو اس کی دوست سے بات کرنے میں اتنی مشغول ہوگئی کہ انھیں ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں

کھلاتی ......اور اگلی بار ایسا کچھ پھر دہرایا گیا تو وہ اسے طلاق دے دے گا۔ طلاق کا نام سن کر ہی ماں باپ تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کی بڑی بیٹی جانکی کے ساتھ پہلے ہی حادثہ ہو چکا تھا۔ اب چھوٹی بھی ایک بیٹے کو گود میں جھلاتے، ماں باپ کے دروازے پر آکر کھڑی ہو جائے تو انھیں دوزخ کی سب سے بڑی مصیبت برداشت کرنی پڑے گی۔

''اتنی بھی تمھیں عقل نہیں کہ پہلے شوہر کا خیال کرے۔ صبح سے کام پر گیا شوہر رات کو واپس آتا ہے۔ یاد رکھنا، اسے تو نے شکایت کا موقع دیا تو ہمارے گھر کے دروازے بند ہیں تیرے لیے۔'' بیٹی کو گھر بلا کر ماں باپ نے تنبیہ کی جھڑی لگا دی۔ ایک نمک کو لے کر اتنی بات بڑھ جائے گی اور اس کے کردار پر سوال قائم ہونے لگیں گے۔ یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شادی کی پہلی سال گرہ پر ہی ایک بیٹا اس کی گود میں تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے کو کلیجے سے لگا کر روتی رہی اور یہ ٹھان لیا کہ وہ اپنے والدین کو شکایت کا دوسرا موقع نہیں دے گی۔

اس کے بعد تیس سالوں میں وہ کبھی نمک اور کالی مرچ رکھنا نہیں بھولی۔ ''نمک'' کے ذکر سے ہی ہمیشہ اس کی نسوں میں ڈر سا دوڑ جاتا ہے۔ ایک انجانے خوف، کشیدگی اور دہشت کو وہ تیس سال سے برداشت کرتی رہی۔

تیس سال بعد بھی صاحب اپنے نمک پر قائم تھے۔ انھوں نے وہی پھر دہرایا۔ چمچے کو ٹن سے کھنکاتے ناک چڑھا کر بولے۔ ''سنا نہیں، نمک کم ہے! ڈالا ہی نہیں! لگتا ہے، بھول گئی!''

سِیا اپنی پلیٹ میں سے کٹے ہوئے پپیتے کے ٹکڑوں کو کانٹے میں پھنسا کر آہستہ آہستہ منھ میں ڈالتی رہی۔ پپیتے کا ایک بڑا ٹکڑا چبانے کے بعد گلے سے نیچے اتر گیا تو آہستہ آواز میں بولی۔ ''نہیں، بھولی نہیں۔ ڈاکٹر نے کم نمک کھانے کو کہا ہے یاد نہیں؟ آپ کا، بی پی، ہائی ہے پھر بھی لینا ہو تو آپ کے سامنے ہی ٹرالی میں پڑا ہے۔''

• • •

اپنے گھر میں عزت سے جینے کا حق

ہندوستانی معاشرے میں پدرسری نظام کی جڑیں اتنی دور تک گہری پھیلی ہیں کہ اپنے چہار جانب جہاں بھی نظر دوڑائیں، آپ کو ہر طرف پدرسری نظام سے ملے غیر ضروری دباؤ کی مختلف قسمیں نظر آجائیں گی۔

یہ کسی ایک عورت کی کہانی نہیں ہے۔ ایسی خواتین کی جماعت کافی وسیع ہے۔ خواتین حقوق مراکز میں کام کرنے والی اراکین ایسی عورتوں سے بخوبی واقف ہیں جو تاعمر خوف میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ جب 30 مارچ 2008 میں میرا مضمون ''داوائلنس آف سائلنس'' شائع ہوا تھا تو ایسے لاتعداد واقعات منظر عام پر آئے تھے۔ واقعات بے شک چھوٹے تھے۔ اتنے ہی چھوٹے جتنے کہ اس کہانی میں ہیں، اس کے بعد ردعمل، اس کے پیچھے کا مائنڈ سیٹ زندگی کو بے رونق کرنے کے لیے کافی تھا۔

''جس کے نشان نہیں دکھتے'' ...... مضمون ایک مدعا ہے۔ مرد کے کام کا بڑا دائرہ عورت کے لیے صرف کچن۔ جب سے فیملی بنی تب سے یہ دوئم درجہ طے پایا۔ مرد نے عورت کو گھر کے کام دیے۔ وہ باہر گیا۔ گھر سے نکلنے اور واپس ہونے کے درمیان اس کی نوکری کے گھنٹے طے ہوئے لیکن عورت کے کام کے گھنٹے طے نہیں ہوئے کیوں کہ وہ باہر گئی ہی نہیں۔ ایک گھریلو عورت کے کام کے گھنٹے صبح سے شروع ہوتے ہیں اور سونے تک چلتے رہتے ہیں۔ چوں کہ مرد کے کام کے گھنٹے طے تھے اس لیے اس کا معاوضہ بھی طے تھا۔ پیسے ملنے کے سبب اس کا درجہ بھی طے تھا۔ لیکن عورت پر سب تھوپا ہوا تھا۔ اس لیے عورت کا درجہ ابتدا سے ہی کم تر رہا۔ کئی مرتبہ شوہر اور سسرال والے نہیں چاہتے کہ لڑکی نوکری بھی کرے۔ کئی مرتبہ نوکری سے دست بردار ہونے پر شادی کی شرط رکھ دی جاتی

ہے۔ یہ ایک لڑکی کو باہر کے اسپیس سے علاحدہ کرنے کا لا جواب اوزار ہے۔ گھر میں بنا کسی رقم کے کام کرنے کا درجہ اتنا بلند بتایا جاتا ہے کہ عورت اپنے وجود کی بخوشی قربانی دے دیتی ہے۔

اس کے بعد شروع ہوتا ہے ازدواجی زندگی کا ایک اور جنگی میدان، کھانے کی میز۔ لڑکیاں اس مہاورے کو سچ مان لیتی ہیں کہ مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ ''داوے ٹو آ مینس ہارٹ اِز تھورو ہیز اسٹمک'' وہ نہیں سمجھ پاتی کہ کھانا ہی ایک وجہ نہیں اسے الجھائے رکھنے اور دباؤ میں رکھنے کا ایک صرف ایک بہانہ ہے۔ اسے سمجھنے کے بجائے وہ تا عمر نئے سے نیا کھانا بنانے اور کھانے میں نئے تجربے کرنے کے طریقے ایجاد کرتی رہتی ہیں۔

دراصل ''نمک'' کہانی کی سِیا طویل عرصے تک پہچان نہیں پاتی کہ نمک صرف وہاں نمک نہیں ہے۔ صرف نمک ہوتا تو خود اٹھ کر لے لیا جاتا یا مانگ لیا جاتا۔ نمک ایک ہاتھ آیا مدعا ہے۔ جسے شوہر کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا اور اس کے لیے نمک کا نہ ہونا ہی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اس مدعے کی ڈور پکڑ کر بیوی کے کردار اور طلاق تک بآسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ اپنے شوہر کو صاحب یا سر کا درجہ دیتے ہی وہ غلام کے کردار میں آجاتی ہے۔ غلام کی آنکھیں نیچی اور آواز نرم رہتی ہے۔ ماں کے گھر سے ہی اسے یہی کرنے کی تنبیہ کی جاتی ہے۔ گھر کتنا ہی عالی شان ہو، شوہر کتنا بھی زیادہ تعلیم یافتہ ہو، تہذب یافتہ ہو، اگر عورت خود غلام کے کردار میں آ کر کانپتی رہتی ہے تو باہر جانے والا مرد مالک کے رتبے سے کیوں نہیں آئے گا؟ نمک کہانی کی ہیروئن کو اپنی آواز ماحول کے حساب سے ڈھالنے میں تیس سال لگ گئے۔ فیملی بنی رہی۔ بچے بڑے ہو گئے۔ اپنی حالت زار کی شناخت ہوئی تب آواز میں ایک منجھی ہوئی گھوڑے جیسی طاقت آئی اور شوہر کی صحت کے علاوہ حکم عدولی کرنے کی تاب بھی شامل تھی۔

آج حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ لڑکیاں خود اعتمادی دکھا رہی ہیں۔ ایک عرصے تک لڑکیوں سے نوکری کروانا ایک عام متوسط گھرانے میں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور ایسے خاندان کو لوگ گری نظروں سے دیکھتے تھے جن کی لڑکیاں نوکری کرتیں تھیں۔ ہندوستانی معاشرے کے متوسط ساخت میں ہم نے لڑکیوں کو موڈرن اور خود اعتمادی تو دلوائی لیکن وہ ماحول ساز گار کرنے سے قاصر رہے۔ جہاں یہ خود اعتمادی اسے برابر کا حق دلا پاتی۔ یعنی مجموعی طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے

کہ لڑکیاں تعلیم سے بہرور ہورہی تھیں نوکری کررہی تھیں، اس کے باوجود ہمارے متوسط طبقے نے ایک طے شدہ ڈھانچہ بنا رکھا تھا۔ ایک فکسڈ پیٹرن، جس میں پڑھی لکھی لڑکی کو ٹھوک پیٹ کرفٹ کر دیا جاتا تھا۔ سماج نے سب کی خصوصیات طے کر رکھیں تھیں۔ مرد کا اسپیس باہری اور عورت کا اسپیس گھر کی چہار دیوری کے اندر۔ عورت نے جیسے ہی اس سرحد کو پار کیا فوراً ہی سوال اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر کردار کشی کی جانے لگی، عورت کو باہری دنیا سے ہمیشہ کاٹنے کی کوشش کی گئی۔ یہیں سے مخالفت کی آواز بلند ہونے لگی، یہیں سے لاوا پھوٹا۔

افسوس یہ ہے کہ بڑے طبقے کی ذہنیت آج بھی نہیں تبدیل ہوئی۔ آج بھی وہ اسی کے ساتھ جی رہے ہیں کہ چاہے لڑکی باہر کتنے بڑے عہدے پر ہو، گھر واپس آتے ہی باورچی خانہ اسی کا ہے۔ اگر شوہر اس کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا ہے تو اس کا احسان چاہے نہ جتائے لیکن خود کو پیڈسٹل پر کھڑا کر لیتا ہے۔

آج جب نوجوان لڑکوں کو بیوی کے نوکری سے واپس آنے پر چائے بنا کر انتظار کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو آنکھوں میں چمک آجاتی ہے کہ اس تبدیلی کا خیر مقدم ہونا چاہیے جو ہماری نوجوان لڑکیوں کو کافی مشقت کے بعد حاصل ہوا ہے۔ مذکورہ حالات میں جیسے، جیسے ماحول سازگار ہوگا ازدواجی زندگی میں روشنی ضرور آئے گی اور ایک نوکری پیشہ لڑکی اور گھریلو لڑکی کو گھر کی چہار دیواری کے اندر عزت ملے گی جس کا وہ صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔

اعلیٰ متوسط طبقے کا ماحول اتنا مایوس کن نہیں ہے۔ نوجوان نسل کی تصویر اس سے بالکل مختلف ہے۔ آج کی نوجوان لڑکیوں کے دماغ میں ایک کونا اپنے لیے طے ہے۔ وہ شادی سے زیادہ فوقیت اپنے کیریئر کو دیتی ہیں۔ اور یہیں سے منو اسمرتی بغلیں جھانکنے لگتی ہے۔ یہ لڑکیاں اپنی شرطوں پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ شوہر کو حاوی نہیں ہونے دیتی۔ کیریئر کو زیادہ فوقیت دینے کے سبب مردوں کو اپنی کرسی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی قدیم پدرسری تہذیب کو خیر باد کرنے پر ہی انھیں حالات سازگار دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ موجودہ دور کی لڑکیاں اپنی کیریئر کی اونچائیوں تک رسائی حاصل کرتی جاتی ہیں اور اپنی پرانی نسلوں کی طرح ''نو الٹرنیٹو'' ماحول کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔

• • •

Ek Aurat ki Note Book

Translated by

Dr. Zafar Alam

ڈاکٹر ظفر عالم نے اردو قارئین کے لیے سدھا اروڑا کی کتاب "ایک عورت کی نوٹ بک" کا ترجمہ اس کی اہمیت، افادیت اور معنویت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندی سے اردو میں کیا ہے۔ اس کتاب میں وہ ساری باتیں درج ہیں جن کا تعلق ایک عورت کی مجموعی زندگی سے ہے۔ زمانہ دراز سے عورتوں پر مظالم کے مختلف طریقے سامنے آتے رہے ہیں لیکن ایک مہذب معاشرے میں تشدد کی کوئی بھی شکل برداشت نہیں اور نہ ہی دنیا کے کسی مذاہب نے عورتوں پر تشدد کرنے کی اجازت دی ہے۔ جب کسی بے بس، کمزور اور ناتواں عورت پر ذہنی یا جسمانی تشدد کیا جائے تو اس وقت نہ صرف خواتین بلکہ پورے معاشرے کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ اس تشدد کے خلاف آواز بلند کریں۔ کسی بھی ملک کا نظام وہاں کے عوام اور قانون ساز اداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ تمام بین الاقوامی ادارے خواہ وہ اقوام متحدہ ہو یا علاقائی ادارے اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ دنیا کے ہر حصے میں ہر شخص کو بغیر کسی امتیاز کے ایک بہتر اور باوقار صحت مند زندگی گزارنے کے لیے پرسکون ماحول اور بہتر معیار زندگی مہیا کرائی جائے اور عورتوں پر ظلم کرنے والوں کے خلاف سخت قانون بنائے جائیں۔ ہندوستان میں بھی مہیلا آیوگ، خواتین حقوق کمیشن وغیرہ قائم کیے گئے ہیں۔ عورت کو مرد سے الگ کر کے دیکھنا ہمارے اصول و نظریات کے خلاف ہے لیکن عورتوں پر ہونے والے ظلم کے تئیں معاشرے میں بیداری پیدا کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔ سدھا اروڑا نے اس کتاب میں بنیادی طور پر خواتین کے استحصال سے متعلق چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور واقعات کو یکجا کر کے موضوع بحث بنایا ہے۔

اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر ظفر عالم (خالد ظفر) ہیں جنھوں نے دہلی یونیورسٹی سے بعنوان "ترقی پسند تحریک اور عبدالعلیم کی دین" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ موصوف اردو کے ساتھ ساتھ ہندی ادب سے بھی والہانہ شغف رکھتے ہیں۔ ملک کے موقر ادبی رسائل و جرائد میں ان کے مضامین، مقالات اور تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قوی امید ہے کہ ہندی ادب میں موجود تانیثی ادب کو سمجھنے میں یہ کتاب معاون و مددگار ثابت ہوگی۔

محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

ریسرچ اسسٹنٹ این۔ سی۔ پی۔ یو۔ ایل (نئی دہلی)